میں مسیحی کیوں نہیں ہوا



مؤلف

میاں ظفر اقبال صاحب

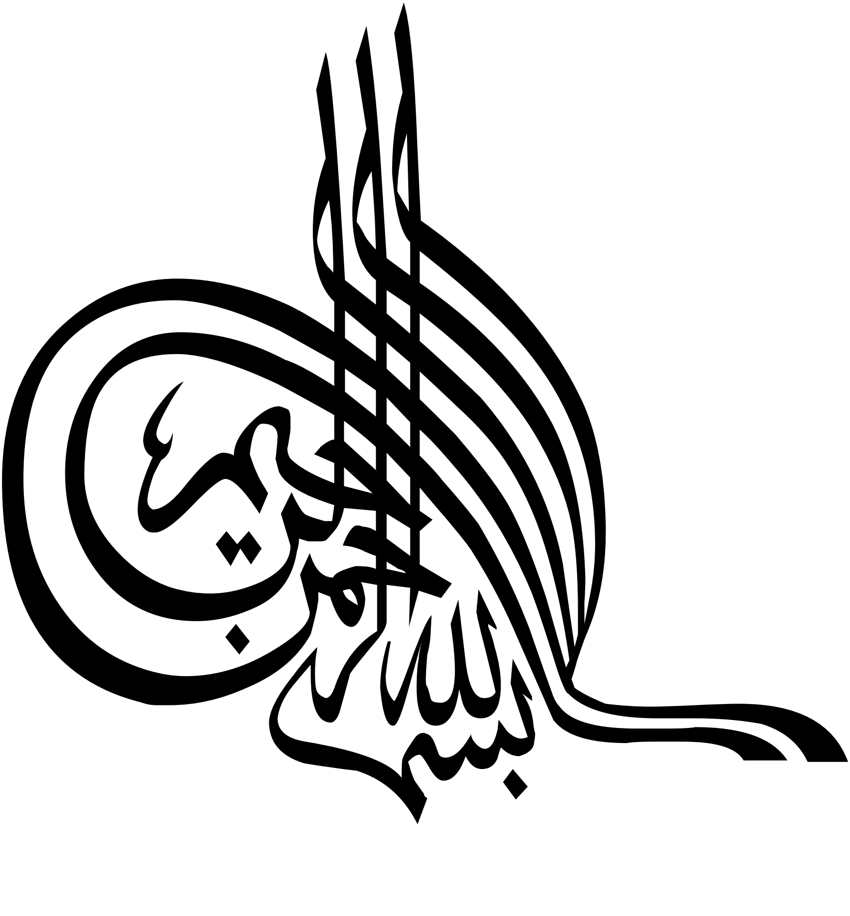
میں مسیحی کیوں نہیں ہوا

مؤلف

میاں ظفر اقبال صاحب

تفصیلات

نام کتاب	میں مسیحی کیوں نہیں ہوا
مؤلف	میاں ظفر اقبال صاحب
سنہ اشاعت	سنہ ۲۰۲۲ء/ سنہ ۱۴۴۳ھ
ترتیب وتزیین	محمد عدنان فاروقی


بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	پہلا باب (تمہیدی کلمات)	۴
۲	کیا مسیحیت راہ حق ہے یا ایک فکری التباس	۴
۳	مسیحیت سے میری مایوسی	۴
۴	دوسرا باب	۸
۵	کیا مسیحت کے عقائد یسوع مسیح کے دیئے ہوئے ہیں	۸
۶	تیسرا باب (مسیحی عقائد کا جائزہ)	۱۲
۷	فصل اول عقیدہ کفارہ	۱۲
۸	عقیدہ کفارہ کا موجد	۱۳
۹	فصل دوم عقیدہ تجسیم	۲۲
۱۰	فصل سوم عقیدہ تثلیث	۲۷
۱۱	فصل چارم عقیدہ نجات	۳۱
۱۲	کیا انسان کو دنیا کا کوئی دین نجات نہیں دیں سکتا	۳۵
۱۳	مسیحیت اور مسئلہ نجات	۳۸
۱۴	یسوع مسیح کا رائے مسئلہ نجات پر	۳۹

۱۵	مسیحی پوادر پر اتمام حجت	۴۳
۱۶	فصل پنجم کیا یسوعؑ کی بحیثیت مسیح عہد قدیم میں کوئی شناخت موجود ہے	۴۵
۱۷	مسیحی دلائل کا تجزیہ	۴۸
	تمت	

پہلا باب

(تمہیدی کلمات)

کیا مسیحیت راہ حق ہے یا ایک فکری التباس:

سوال یہ ہے کہ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے زندگی کے اڑتیس برس غور و فکر پر صرف کرنے کے بعد اگر میری رائے مؤخر الذکر (فکری التباس) کے حق میں ہے تو کیا میں واقعی درست نتیجہ اخذ کرنے میں کامیاب رہا ہوں یا پھر مجھے دوبارہ از سر نو تفتیش و تحقیق کی ضرورت ہے؟ میں جانتا ہوں کہ خوش عقیدہ مسیحی دوست بلا تاخیر مجھے دوبارہ تحقیقات کرنے کی فرمائش پر زور دیں گے لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہیں گے کہ اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے مجھے کن کن گھاٹیوں کو عبور کرنا پڑا ہے۔

مسیحیت سے میری مایوسی:

مسیحیت سے میری مایوسی کے اسباب کیا ہیں، آسانی کے لئے میں انہیں دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہوں:

(۱) اول مسیحی اہل علم کا رویہ اور ان کا طریق کار۔ (۲) دوم مسیحیت کے سمجھ میں نہ آنے والے محیر العقول عقائد۔

اس معاملے پر گفتگو کرنے سے شاید بہتوں کا بھلا ہو جائے یا زیادہ صحیح تر الفاظ میں ممکن ہے کہ میرا اپنا بھلا ہو جائے۔

(۱) مجھے سب سے زیادہ مایوسی کا سامنا اس وقت کرنا پڑا جب میری کسی پادری صاحب سے گفتگو ہوئی، ہر بار گفتگو کے بعد میری یہ رائے پختہ تر ہوتی چلی گئی کہ پادری صاحب اپنی روزی

روٹی سے محرومی کے خطرہ کے پیش نظر کبھی بھی سچائی بتانے کی جرات نہیں کر سکتے۔ ہر پاسٹر صاحب کی طرف سے مجھے قرآن مجید پڑھنے کا مشورہ دیا گیا، میں آج تک سمجھ نہیں پایا کہ کیا مسیحی ہونے کے لیے قرآن مجید پڑھنا ضروری ہے یا انجیل؟ یوادر ایک مسلمان کو انجیل پڑھانے سے کیوں گھبراہٹ محسوس کرتے ہیں؟ کوئی بھی شخص اپنے آبائی مذہب کو بالائے طاق رکھ کر سچائی کی تلاش میں نکلے تو کیا اسے مسیحیت کی سچائی جاننے کے لئے دوبارہ اپنی کتب خوانی کی ضرورت ہے؟ کیا مسیحیت کی سچائی اپنی کتب سے زیادہ دوسروں کی کتابوں پر منحصر ہے؟ کیا وہ سوالات سے ڈرتے ہیں یا پھر اپنی کسی کمزوری کی پردہ داری مقصود ہے؟ میری جب بھی کسی مسیحی سے گفتگو ہوئی، ساری خوش فہمی کہ میں کسی صاحب علم سے گفتگو کر رہا ہوں لمحہ بھر میں کافور ہو گئی اور مجھے شدت سے احساس ہوا کہ میں ایک ایسے فرد سے بات کر رہا ہوں جسے مسیحیت کی کم مائیگی کا نہ صرف پورا پورا ادراک ہے بلکہ اب اس کے سامنے فقط یہی چارہ کار باقی رہ گیا ہے کہ زیر بحث موضوع کا رخ کس طرح غیر متعلقہ امور کی طرف موڑ دیا جائے یا اس کوشش میں ناکامی کی صورت میں تاویلات کا انبار کیسے لگایا جائے۔ وہ مسیحیت کے بارے میں اس سچائی سے آگاہ ہونے کے باوجود اسے ترک کرنے پر کیوں آمادہ نہیں؟ اس کا جواب اصولاً خود انہیں دینا چاہیے۔ اگرچہ اس کا جواب میرے ذمہ نہیں لیکن میں اپنی رائے، جس سے بہرحال اختلاف کی گنجائش موجود ہے، ان الفاظ میں دینا چاہوں گا، حق سے آگاہ مسیحی دوستوں کے اس رویہ کے پس پردہ پرانی کمیونٹی میں سماجی حیثیت اور مالی مفادات کے خاتمے کے ساتھ ساتھ نئی کمیونٹی میں باعزت انجذاب کے عمل میں ناکامی کا خوف جیسا عنصر کارفرما ہے کیونکہ برصغیر میں ذات پات کا نظام مضبوط اور خون میں رچا بسا ہے، ذات پات کا یہ نظام مقامی لوگوں کی سوچ میں اس قدر گھر کر چکا ہے کہ تبدیلی مذہب بھی ذات پات کی بندشیں ڈھیلی نہیں کر پاتی، چونکہ برصغیر میں مسیحیت کا آغاز مقامی طور پر مضبوط ذات پات والے سماجی نظام میں بہرحال سب سے نچلے طبقے (شودر

جاتی) میں ہوا اور اس (مسیحیت) پر اس (سماجی لحاظ سے نچلے کمتر طبقہ) کی چھاپ اتنی گہری ہے کہ اس کے افراد کے لئے آسان نہیں ہوتا کہ وہ اپنا مذہب ترک کر کے اپنے سے سماجی طور پر بلند طبقہ میں برابری کی سطح پا سکیں، دوسری طرف گو کہ اسلام بھی سماجی برابری کا علمبر دار ہے لیکن برصغیر کے ان لوگوں کے اذہان سے وہ بھی ذات پات کی بندشیں ڈھیلی کرنے میں کما حقہ کامیاب نہیں ہوسکا اور مقامی لوگوں میں باوجود قبول اسلام کے برادری سسٹم اتنا مضبوط رہا کہ برادری کے باہر رشتہ ناتہ بہت حد تک معیوب سمجھا جاتا ہے یعنی کہ دین تبدیل کر لینے کے باوجود مقامی ثقافت کی گرفت کمزور نہیں ہوسکی، مقامی مسلمانوں کا یہ رویہ حق شناس لوگوں کے لیے مجموعی طور پر حوصلہ افزا نہیں ہے، اہل اسلام کا یہ رویہ دینی نہیں بلکہ برصغیر کی ہزاروں سالہ ثقافتی میراث کی سوغات ہے۔

(۲) مسیحیت ابتدا میں ہی اپنے اصل راستے سے منحرف ہوتی واضح طور پر نظر آ جاتی ہے، مسیحیت کا موجودہ تاریخی مواد، جسے الہامی کہہ کر پیش کیا جاتا ہے، دراصل اسی فرقے کا مرتب کردہ ہے جس پر اسے راہ راست سے بھٹکانے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، یسوع مسیح ایک یہودی فرد تھے اور یہودیت کے ہی سماجی و الہامی پس منظر میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے اور ان کے پیشِ نظر یہودیت سے کسی علیحدہ دین کا کوئی خیال نہیں تھا لیکن موجودہ مسیحیت قطعی طور پر ہر لحاظ سے سے یہودیت سے ایک الگ تھلگ دین اور نظریہ ہے جس کی یہودیت سے وابستگی فقط اس قدر ہے کہ عہد قدیم سے یسوع کی صداقت ثابت کی جائے، مسیحیت اب یہودیت کی اصلاح شدہ شکل نہیں ہے بلکہ اس کے متوازی ایک نظریاتی دین ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسیحیت کو جس گروہ نے موجودہ شکل میں متشکل کیا وہ یہ ثابت کرنے میں ناکام رہا کہ یسوع نے یہودی نظام سے ہر قسم کا تعلق ختم کر دیا تھا اور ایک نئے دین کے بانی اور یہودیت سے ہٹ کر نیا کچھ دینے آئے تھے۔

(۳) ان تمہیدی کلمات کے بعد ہم مسیحی عقائد کا اختصار سے جائزہ لیں گے: کفارہ، تجسیم، تثلیث، نجات اس دین کے بنیادی عماد ہیں جن پر ہم آئندہ گفتگو کریں گے۔

دوسرا باب

کیا مسیحت کے عقائد یسوع مسیح کے دیئے ہوئے ہیں:

مسیحی عقائد پر گفتگو سے قبل اس فریب خوردگی کا ادراک ضروری ہے کہ مسیحیت کے عقائد یسوع مسیح کے دیئے ہوئے ہیں۔ بعض عقائد میں سوائے لفظی مماثلت کے کچھ بھی موجود نہیں اور بعض میں تو یہ لفظی مماثلت بھی موجود نہیں ہے بلکہ سب کچھ بعد کے لوگوں کی ایجادات ہیں. یہ تو اصولی بات ہے کہ عقیدہ کشید شدہ نہ ہو بلکہ الہامی تعلیم سے دیا گیا ہو یعنی کہ ایسا نہیں ہوسکتا کہ پہلے کسی کتاب کو کسی پنچایت کے ذریعے خود الہامی ٹھہرایا جائے اور پھر اس میں سے کھینچا تانی سے انسانی رائے سے عقائد بنا کر انہیں آفاقی سچائی کے طور پر اپنا لیا جائے۔ اصولاً عقائد صاحب الہام کو خود بتانے چاہئیں نا کہ مریدین بعد میں مجالس برپا کر کے یہ فیصلہ کرتے پھریں کہ اس ورس سے یہ بات برآمد ہوتی ہے اور اُس سے وہ (یہی وجہ ہے کہ مسیحی دوست آج تک بعض عقائد پر اب تک برسرِ پیکار ہیں جن میں سرفہرست تثلیث اور تجسیم ہیں) اسی طرح کتابوں کو الہامی بنانے کا عمل (Canonization) بھی ایک مغالطہ دہی کے سوا کچھ نہیں، یہ کیا بات ہوئی کہ عمومی طور پر لکھی کتب کو صدیوں بعد جا کر کچھ لوگ اپنی رائے سے یہ قرار دیں کہ فلاں کتاب الہامی ہے اور فلاں نہیں جبکہ دونوں قسم کی کتب مطالعہ کے لئے متداول و مروج ہوں، من پسند کتب الہامی بناتے ہوئے یہ بات نظر انداز کر دی جاتی ہے کہ الہام بطور الہام قلمبند ہونا چاہیے۔ (''جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے توریت لکھی'' (خروج 34:27)/ استثناء 31:9) یا جیسا کہ ''یرمیاہ نبی نے خدا کا کلام ایک طومار میں لکھوایا'' (یرمیاہ 36:2) نا کہ کچھ مجہول الحال لوگوں کی وقائع نویسی اپنی رائے سے الہامی بنا دی جائے یا بعد میں لوگ اپنی پسند سے الہامی کتاب منتخب کرتے پھریں۔

اناجیل کی زبان بھی وہ نہیں جو خود المسیح کی تھی یعنی کہ ان کے پیغام کا ترجمہ غیر زبان میں کر دیا گیا ہے، یوں ترجمہ کر دینے سے یسوع کے حقیقی الفاظ اپنے وجود کے ساتھ ساتھ اپنا مفہوم بھی کھو بیٹھے ہیں اور ترجمہ ہی اصل کی جگہ لے چکا ہے ہر شخص جانتا ہے کہ ترجمہ اصل کی جگہ نہیں لے سکتا ان کے پیغام کے غیر محفوظ ہونے پر اس سے بڑی کیا دلیل دی جائے کہ چرچ خود اقرار کرتا ہے کہ ہمارے پاس یسوع کے اصل الفاظ موجود ہی نہیں ہیں، کوئی مسیحی یسوع مسیح کے حقیقی الفاظ سامنے نہیں لا سکتا یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مسیحیت کو یسوع مسیح نے نہ تو کوئی نئے عقائد دیئے ہیں اور نہ ہی وہ دینے آئے تھے اور نہ ہی اس کی کوئی ضرورت تھی کیونکہ یسوع مسیح نیا دین لے کر آئے ہی نہیں تھے وہ یہودیت میں بطور مسیح مبعوث ہوئے۔ مسیح کے کاموں کے متعلق کتاب مقدس میں بہت سے حوالہ جات موجود ہیں لیکن اختصار کی خاطر ایک ہی حوالہ پیش کروں گا۔

کتاب مقدس کے مطابق ان کے ذمے داؤد کے گھرے خیمے کی ایستادگی تھی (عاموس 9:11) لیکن مسیحی تھیالوجی میں یہ بنیادی نکتہ زیرِ بحث ہی نہیں لایا جاتا یا یہ کہہ کر جان چھڑا لی جاتی ہے کہ ایسا بعثت ثانیہ میں ہوگا لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک مدعی کی شناخت ہی یہی نکتہ ہو اور وہ آ کر چلا بھی جائے لیکن اپنی بنیادی شناخت ہزاروں برس بعد کے کسی وقت پر چھوڑ دے اور اپنی شناخت کے اصل کام چھوڑ کر معجزات دکھانا شروع کر دے اور اصرار بھی کرے کہ مجھے میرے کاموں سے پہچانو (یوحنا 14:11)

اس صورت میں تو مسیح کو بطور مسیح شناخت کرنا ہی ناممکن اور محال ہو جائے گا کسی بھی فرستادہ خدا کی پہچان کے لیے بعثت ثانی کی صورت میں صدیوں تک انتظار ایک مہمل کام ہے، اگر المسیح پہچانا ہی نہیں جاتا تو پھر اس پر ایمان لانے کا تقاضا کیوں کر معقول ہو سکے گا؟ ایک محترم پاسٹر صاحب دوران گفتگو مجھ سے یہ کہہ چکے ہیں کہ:

''المسیح اپنی شناخت کروانے آئے ہی نہیں تھے''

اگر المسیح کتاب مقدس کے دیئے ہوئے مقاصدِ بعثت پس پشت ڈال کر غیر ضروری سرگرمیوں کو اپنی بعثت کا گواہ ٹھہرائے اور دوسری طرف یہ دعویٰ بھی کرے کہ وہ کتاب مقدس کی تنسیخ کرنے نہیں بلکہ تکمیل کرنے آئے ہیں تو پھر مقاصدِ بعثتِ مسیح اور افعال مسیح میں زبردست تضاد واقع ہو جائے گا۔

سوال یہ ہے کہ اس زبردست تضاد کے رفع کرنے اور کتاب مقدس کی روشنی میں قوم کو اطمینان دلانے کی کیا صورت ہوگی؟ (کتاب مقدس تو قرار دے کہ المسیح کے وقت داؤد کا گرا ہوا مسکن دوبارہ کھڑا ہو جائے گا اور اس میں رخنوں کی مرمت کر دی جائے گی لیکن المسیح ہونے کی دعوے دار ہستی بجائے رفعت بحال کرنے کے الٹا رہی سہی شان وشوکت مٹانے، ہیکل کے ڈھائے جانے اور ایامِ مصائب کے شروع ہونے کی وعید سنا دے تو قوم اسے مسیح کیسے مانے گی اور وہ کیسے مسیح ہوں گے؟) دراصل کتاب مقدس میں جو بھی مسیح ہے وہ بادشاہ ہی ہے یہودیت میں مسیح کا بادشاہت یا حکمرانی کے عہدے کے بغیر تصور ہی ادھورا ہے اور یسوع ایک یہودی ہی تھے نا کہ غیر یہودی، اس لئے ان کے معاملات کا مطالعہ یہودی علم الکلام کی روشنی میں لیا جائے تو پھر ہی درست نتائج تک پہنچا جا سکتا ہے نا کہ خلط مبحث سے۔

اناجیل کے مطابق پیلاطوس کی عدالت میں بھی یسوع کو مسیح بمعنی بادشاہ کے الزام کا ہی سامنا تھا. دیگر الزامات سے رومی گورنر کو کوئی سروکار نہیں تھا اور نہ ہی کوئی دلچسپی، صلیب پر جرم کا کتبہ بھی یہودیوں کا بادشاہ ہونے کا ہی لگا تھا۔(متی ب 27 ورس 11 و 37 / مرقس ب 15 ورسز 2 و 26 / لوقا ب 23 ورس 3 و 38 / یوحنا 18:33 و 19:19)

اس ساری تفصیل سے ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ مسیح نے اگر قوم کو کوئی نجات دلانی بھی تھی تو اس کی نوعیت کیا تھی، بہرحال یسوع کتاب مقدس کے مطابق اپنی بعثت کا نہ تو اثبات کر پائے اور نہ ہی اس کی کوئی قابلِ اطمینان تشریح قوم کے سامنے رکھ سکے اس بات پر کوئی شبہ نہیں کیا

جا سکتا کہ ان کے مشن کی یہی ناکامی چھپانے کے لئے غیر ضروری عقائد تراشے گئے ہیں۔(یاد رہے کہ ہم یہاں قرآن مجید کے عیسیٰ علیہ السلام کی بات ہی نہیں کر رہے کیونکہ مسیحیوں کے ہاں یہی زور دیا جاتا ہے کہ قرآن مجید کے عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کے یسوع الگ الگ ہیں اور ان کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں، اب کوئی مسیحی ان دونوں کو ایک بتانے کی کوشش نہ کرے کیونکہ ہم بذریعہ پوسٹ بھی یہ معاملہ آج سے پانچ سال قبل ہی فیصل کروا چکے ہیں جو سوشل میڈیا پر موجود ہیں۔

تیسرا باب

(مسیحی عقائد کا جائزہ)

فصل اول عقیدہ کفارہ:

بعثتِ مسیح کے متعلق عمومی مسیحی نظریہ یہ ہے کہ وہ انسان کے گناہوں کا کفارہ دینے کے لیے ہوئی تھی، یہ کفارہ کن گناہوں کا تھا؟ چرچ کا قدیمی موقف ہے کہ یہ باغ عدن میں ہوئے گناہ سے متعلق ہے جو بعد ازاں نسل درنسل ذریت آدم میں منتقل ہوتا رہا تا آنکہ سیدنا یسوع علیہ السلام مسیح نے آکر صلیبی قربانی سے گناہوں کی معافی دلا کر انسان کو نجات دلائی۔

عام طور پر مسیحی تھیالوجی میں یہ موروثی یا ازلی گناہ کہلاتا ہے لیکن اب یہ نظریہ دم توڑ رہا ہے اور زیادہ تر مسیحی اس طرف مائل ہو رہے ہیں کہ موروثی گناہ نام کی کوئی شے موجود نہیں بلکہ آدم و حوا کے نافرمانی کرنے سے انسان میں گناہ کرنے کی رغبت اور صلاحیت پیدا ہوگئی اور مسیح کی صلیبی قربانی گناہ کی اس صلاحیت یا رغبت سے نجات دلاتی ہے اور بالآخر انسان اس (قربانی) کے وسیلہ سے ابدی نجات کا مستحق قرار پاتا ہے. بعض مسیحی دوست مسیح کی صلیبی قربانی کا یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ یہ دراصل کسی ازلی یا موروثی گناہ یا گناہ کرنے کی صلاحیت سے نجات نہیں دلاتی بلکہ ہمارے روزمرہ زندگی میں کیئے گئے شخصی گناہوں کو مٹاتی ہے، مسیحی برادری کے موقف میں بتدریج آتی یہ منتشر الخیال تبدیلی کس امر کی غماز ہے؟ اگر یسوع مسیح کی تصلیب واقعی گناہوں کے کفارہ کے لیے ہوتی تو پھر اتنا اختلاف کثیر نہ ہوتا بلکہ اس کی تصریح موجود ہوتی کہ وہ کن گناہوں سے رستگاری دلاتی ہے، یہ ژولیدہ خیالی اس بات کی پختہ دلیل ہے کہ مسیح کی صلیبی موت کو کفارہ قرار دینے والے اس بات کا تعین کرنے میں ناکام رہے کہ انسان بالآخر کن گناہوں

سے نجات پاتا ہے یعنی کہ یہ اختلافات اس عقیدے کے غیر الہامی ہونے پر مہر تصدیق ثبت کر دیتے ہیں ، اگر یہ عقیدہ یسوع مسیح عطا کرتے تو پھر اختلاف کی گنجائش ہی باقی نہ بچتی وہ واضح الفاظ میں بتا دیتے کہ ان کی تصلیب سے کون سے گناہ معاف ہوں گے اگر یسوع مسیح کی صلیبی موت کے ذریعے شخصی گناہوں کا کفارہ دیا جانا تسلیم کر لیا جائے تو کیا یہ جرم وقوع پذیر ہونے سے قبل ہی اس کی معافی کا پروانہ تھما دینا نہیں؟ اس صورت میں تو یہ نہایت انوکھا اصول قائم ہو جاتا ہے. وہ شخص کیوں نہ گناہ کرے جسے گناہ کرنے سے قبل ہی اس کی معافی کا کامل یقین ہو؟

مسیحیوں نے بہت بعد میں لکھے گئے یادداشتی لٹریچر کو ضرورت کے تحت عہد جدید کے نام سے الہامی تسلیم کر لیا کیونکہ یسوع مسیح کوئی نیا مقدس متن چھوڑ کر نہیں گئے تھے اور یہودیت سے چرچ علیحدگی اختیار کرنے کے بعد شدت سے اس کی ضرورت محسوس کر رہا تھا. دیگر کسی دستاویز کی عدم موجودگی میں مسیحی تعلیمات کا واحد مستند ماخذ اب یہی باقی رہ گیا ہے۔

عقیدہ کفارہ کا موجد

پولوس (جسے مسیح کے برسوں بعد غیر مستحکم بنیادوں پر رسول تسلیم کر لیا گیا) نے عقیدہ کفارہ متعارف کرایا اور تصلیب مسیح کی نئی تشریح پیش کی. پولوس کی آمد سے قبل شاگردوں نے جو وعظ دیئے ان میں عقیدہ کفارہ کی بابت کچھ نہیں کہا گیا. پولوسی نظریات کو سینے سے لگانے کے بعد مسیحی نہ تو اس کا انکار کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس کے مقاصد پر متفق ہونے کی کوئی سبیل پاتے ہیں. یہی وجہ ہے کہ ہر مسیحی گروہ الگ تشریح کرتا ہے اور تاویل در تاویل کا بھنڈار کھلا رہتا ہے. بعض مسیحی افراد سرے سے ہی انتقال گناہ کے انکاری ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا نظریہ موروثی گناہ سے ان کا انکار واقعی ایک غیر حقیقی عقیدہ کی اصلاح شدہ

حقیقی شکل ہے؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو اس صورت میں یہ استفسار لازم ہو جاتا ہے کہ کیا چرچ نے دو ہزاریوں تک ایک ایسے عقیدہ کا پرچم تھامے رکھا اور پرچار کیا جس کا کسی بھی طرح یسوع مسیح سے کبھی کچھ تعلق نہیں رہا تھا؟ بعض مسیحیوں کا عقیدہ موروثی گناہ سے انکار سیدھا سیدھا چرچ کو روز اول سے گمراہ اور بدعتی ٹھہراتا ہے مگر یہ تصویر کا محض ایک رخ ہے. اگر چرچ شروع سے ایک غلط راہ پر چل نکلا تھا تو پھر تین سوالوں کا جواب لازم دینا چاہیے۔

اول: ان لوگوں کی نجات کا کیا ہوگا جو یہ عقیدہ اپنائے نجات کی امید میں آخر دم تک اس سے چمٹے رہے؟

دوم: ان متجددین کو چرچ کی گمراہی کا علم کیسے ہوا؟ ان کے علم کا منبع کیا ہے؟

سوم: اگر چرچ صحیح عقیدہ پر گامزن رہا تو یہ متجددین کیوں اور کیسے اس کے انکاری ہو کر صحیح العقیدہ مسیحی رہ سکتے ہیں؟

مزید براں آراء کی یہ باہمی چپقلش یسوع مسیح کی صلیبی موت کے مقاصد پر بھی کڑے سوال کھڑے کرتی ہے. اگر انکار کرنے والا گروہ صحیح العقیدہ ہے تو بات گھوم پھر کر وہیں آجاتی ہے کہ کیا چرچ روز اول ہی سے یسوع کی صلیبی موت کے مقاصد بارے غلط بیانی سے کام لیتا چلا آیا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ یسوع کی صلیب پر ہوئی موت محض ایک پُرخطر ناکام مہم جوئی کا ہولناک انجام تھا جسے بوجوہ کفارہ کی قربانی میں تبدیل کر دیا گیا ہے؟ اگر چرچ کا موروثی گناہ بارے قدیمی موقف غلط ہے اور متجددین کی رائے ہی درست ہے تو کیا یسوع مسیح کی صلیب پر جان دینے کے بعد انسانی سرشت میں موجود گناہ کی طرف رغبت ختم ہوگئی یا گناہوں کا ارتکاب پہلے سے بھی زیادہ ہو گیا؟ عملی مشاہدہ یہ ہے کہ یسوع مسیح کی صلیبی موت کے بعد انسانی سرشت میں گناہ کی طرف رغبت نہ صرف باقی رہی ہے بلکہ گناہوں کا حجم پہلے سے ہزاروں گنا زیادہ ہو چکا ہے. یوں یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ مسیح کی صلیبی موت کا الٹا اثر ہوا ہے لیکن اگر مسیحی

اس نتیجہ سے کوفت محسوس کرتے ہیں تو پھر بھی معترض کو یہ کہنے سے کسی بھی طرح نہیں روکا جا سکتا کہ یسوع مسیح کی مزعومہ قربانی ایک لا حاصل مشق کے سوا کچھ رنگ نہیں لائی اور یہ کہ اس قربانی کے بعد بھی انسان کی اثمی فطرت وہی رہی ہے. با الفاظ دیگر المسیح کی تصلیب سے کچھ بھی نہیں بدلا اور دنیا جوں کی توں ہے۔

دراصل مسیحی عقیدہ کفارہ کی معقولیت ثابت کرنے میں بہت دشواری کا سامنا کرتے ہیں ایک بے گناہ فرد کس طرح دوسروں کے گناہوں کا بار سر پر اٹھا سکتا ہے؟ کیا یہ انصاف کے تمام تر اصولوں کے منافی نہیں؟ خدا کا قانون تو ایک طرف رہا انسان کا اپنا بنایا ہوا قانون بھی اس ظلم کی اجازت نہیں دیتا، خدا کا قانون بھی یہی ہے کہ جو جان گناہ کرتی ہے وہی مرے گی یہ تو ویسے بھی مضحکہ خیز ہے کہ گناہ انسان کرے اور اس کے عوض مرے خود خدا، اگر غیر جانبدار ہو کر دیکھا جائے تو چرچ کا یہ عقیدہ عدل اور رحم ہر دو کی اساس منہدم کرنے والا ہے، عدل کی اساس اس لیے ڈھے جاتی ہے کہ کسی کا گناہ کسی کے سر دھرنا عدل و انصاف کے خلاف ہے اور رحم کی اساس اس لیے منہدم ہو جاتی ہے کہ خدا کسی کو جرم کی سزا بالآخر دے کر ہی رہا چاہے خود کو ہی سہی اس سے تو بہتر تھا کہ وہ اس گناہ کے مرتکب کو ہی سزا دے دیتا کہ اسے بھی مجرم کے حق میں ایک طرح کی رحمت ہی تصور کیا جا سکتا تھا بھلے اس کے رحیم ہونے کی تاویل کرنا پڑتی لیکن ناانصافی کا تو جڑ سے خاتمہ ہو جاتا ویسے بھی اصولاً مجرم کو سزا دینا صفت رحیمی کے منافی نہیں ہوتا موجودہ صورت میں تو مسیحی تصور کے مطابق نہ تو خدا کو عادل کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی رحیم یعنی کہ دونوں صفات بیک وقت رخصت ہو گئیں لیکن ڈھنڈورا یہ پیٹا جا رہا ہے کہ خدا محبت ہے اور شفقت و رحمت کرنے میں غنی اور قہر و غضب میں دھیما ہے نظریہ کفارہ کی موجودگی میں یہ کیسے ممکن ہے؟ مزید براں یہ بات بھی سمجھ سے بالاتر ہے کہ خدا براہ راست اپنے مجرم کو معاف کرنے پر کیوں قادر نہیں تھا اور یہ کہ آدم وحوا کی اس نافرمانی کو معاف کرنے سے عدل کا کون سا ایسا تقاضا ٹوٹ جاتا تھا کہ سزا

دینالازمی تھا؟ سزاتو آدم وحوا کو باغ عدن سے باہر نکال کر دی جا چکی تھی۔ بائبل کے مطابق آدم وحوا کو پھل کھانے سے منع کیا گیا تھا اور اس حکم کی خلاف ورزی کی کوئی متعین سزا سوائے مرنے کے کوئی اور نہیں بتائی گئی تھی اور شروع سے چلی آتی یہ سزا تو المسیح کے کفارہ کے بعد بھی جاری رہی ہے. یوں آدم کو پھل کھانے کی دہری سزا ملی یعنی کہ باغِ عدن بدری بھی اور انجام کار موت بھی. جوا اضافی سزا کی مستحق ٹھہریں جنہیں بچہ کی پیدائش کے وقت دردزہ کی تکلیف کا بوجھ سہنا پڑا.اسی طرح آدم کو بھی محنت سے کما کر کھانے کی الگ مصیبت دان ہوئی عملی صورت حال یہ ہے کہ انسان مسیح کی تصلیب کے بعد نہ تو دوبارہ ابھی تک باغ عدن میں واپس پہنچ سکا ہے اور نہ ہی موت سے رستگاری حاصل کر پایا اور نہ ہی عورتوں کا دردزہ ختم ہوا ہے اور نہ ہی انسان کو روزی کمانے کے لیے محنت سے چھٹکارا ملا ہے حالانکہ مسیحی علم الکلام کے مطابق خدا کے اقنوم ثانی نے انسانی جرائم کا کفارہ دے دیا ہے. کوئی بھی مسیحی یہ کہنے کی پوزیشن میں نہیں کہ کفارہ دیتے ہوئے کوئی کوتاہی ہوگئی تھی جس کی وجہ سے کامل نتائج حاصل نہیں ہو پائے وہ اگر ایسا کہیں گے تو کفارہ کو خود ہی باطل قرار دے دیں گے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر کفارہ کی ادائیگی کے بعد بھی ان سزاؤں کا بلاامتیاز مومن وغیر مومن نفاذ کیوں باقی ہے؟ کیا کفارہ کا عمل غیر کامل رہا؟ باغ عدن میں نافرمانی پر مبنی گناہ خود خدا کے صلیب پر جان دینے سے کیسے معاف ہوا؟ یہ صورت حال کتنی ہی نامعقول کیوں نہ لگ رہی ہو، مسیحیوں کی نظر میں کفارہ خدا اور انسان کی صلح کے لیے خدا کا انتظام ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ بنیادی مسیحی عقیدہ بھی ہے لیکن اگر یہ خدائی انتظام ہے تو پھر اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایمان لانے کی شرط کیوں؟ کیا خدائی انتظام کے دیگر مظاہر سے انسان بلاتفریق فائدہ نہیں اٹھاتے؟ خود انجیل میں مندرج ہے کہ خدا نیک اور شریر دونوں کے لئے یکساں سورج ان کے سر پر چمکاتا ہے، اگر یہ قربانی بنی نوع انسان کے لیے خدائی انتظام تھا تو اس لحاظ سے یہ بلامشروط سب کے

لیے ہونی چاہیے، کچھ مسیحی یہ فرماتے ہیں کہ یہ عوضی قربانی ہے لیکن یہ عوضی والا نظریہ تو اصول عدل کے منافی ہے کہ طویلے کی بلا بندر کے سر جیسا اندھیر تو دنیاوی عدالتوں میں بھی نہیں ہوتا تو خدا کی بادشاہی میں یہ اندھیر کیسے مچ سکتا ہے؟ یہ تصور تو نہایت مضحکہ خیز ہے کہ خدا کسی کے گناہ معاف کر کے اپنی قدرت اور بالا حیثیت منوانے کی بجائے خود دوسروں کے گناہوں کے عوض مرتا پھرے. اگر خدا مر کر ہی بنی نوع انسان کو نجات دے سکتا ہے تو لازمی ہے کہ وہ فرداً فرداً ہر شخص کے بدلے موت قبول کرے کیونکہ اصولاً تو ایک بار مرنے سے ایک ہی شخص کے گناہ معاف ہونے چاہئیں. اگر ہر ہر فرد کے لیے مرنا ضروری نہیں ہے تو پھر اجتماعی طور پر بھی معافی دینے کے لیے اکیلے خدا کا مرنا ضروری نہیں ہے. یہ بات تو قطعاً غیر معقولی ہے کہ مرے خدا اور گناہ معاف ہو جائیں کل انسانوں کے بذریعہ تصلیب گناہوں کے کفارہ کا تصور اس قدر غیر معقول اور غیر منطقی ہے کہ خود اس کے خالق کو بھی اس کا برملا اقرار کرتے بنی۔

پولوس لکھتے ہیں:

''صلِیب کا پَیغام ہلاک ہونے والوں کے نزدِیک تو بیوُقوفی ہے مگر ہم نجات پانے والوں کے نزدِیک خُدا کی قُدرت ہے''۔(1 قرنتیوں 1:18)

پولوس کا یہ قول یہود کا وہ ردعمل سامنے لاتا ہے جس کا برملا اظہار وہ دیگر مشرک اقوام سے مستعار لی گئی یہ بے ڈھنگی اور انوکھی تعلیم سن کر رہے تھے۔

اگرچہ وہ (پولوس) ہلاک ہونے والوں سے مراد یہود لیتے ہیں. وہ ایسا کیوں سمجھتے ہیں؟ کیا مسیحیت کا پیغام رد کر دینے کی وجہ سے؟ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہودی شریعت اور وحی کا علم رکھنے کے باوجود اہل شعور نہیں تھے؟ پولوس یہود سے کس قسم کے شعور کی توقع رکھتے تھے؟ کیا یسوع مسیح اور شاگردوں سے گفتگو یہود کے جاہل افراد کیا کرتے تھے یا اہل علم؟ ایک بھی گواہی نہیں ملتی کہ یسوع کو کتاب مقدس سے واقف کسی یہودی عالم نے قبول کیا ہو. یسوع مسیح خود بھی تو یہودی تھے

اور انہی کتب کا علم رکھتے تھے اور انہی کے حوالے دیتے تھے جن کا فقیہہ وفریسی تو پھر یہودی اتنے بے شعور کیوں رہے کہ یسوع کو ٹھکرا کر ہلاکت کے دہانے پر پہنچ گئے؟ یسوع مسیح اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود یہود کو کیوں قائل نہیں کر پائے؟ اہل وحی یہودی تو بے شعور (جو المسیح کو پہچان کر ایمان نہ لا سکے) لیکن پیگن یعنی مشرک بت پرست اقوام باشعور (جنہوں نے یسوع کو پہچان لیا اور ایمان بھی لے آئے) کیا یہ بات اچنبھا نہیں؟ مشرک اقوام نے کیسے یسوع کو بحیثیت مسیح شناخت کرلیا جبکہ وہ کتاب مقدس سے ناواقف تھے؟ سوچنے کی بات ہے کہ اگر یہود کو اخروی نجات درکار تھی اور ان کی یہ ضرورت ایک شخص اپنے خون سے پوری کر رہا تھا اور یہود فقط ایمان لا کر اس کے حق دار بن جاتے اور بدلے میں شریعت کی پابندیوں سے بھی آزاد ہو جاتے تو وہ کیوں ایمان نہ لا سکے؟ اس صورت میں اہل حماقت ایمان لانے والے (مسیحی) نہیں بلکہ ایمان سے محروم (یہود) بنتے ہیں جو اتنی آسان نجات قبول کرنے سے قاصر رہے۔ سوال تو یہ ہے کہ یہود نے اتنا آسان نجات بخش پیغام کیوں نہ قبول کیا اور کیوں سختی سے اپنے موقف پر ڈٹے رہے؟ تصلیب مسیح سے منسلک ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ مسیحی تھیالوجی کے مطابق یسوع مسیح کی صلیبی موت سے شریعت منسوخ ہو کر دور فضل کا آغاز ہو گیا ہے. اگر ایسا ہے تو مسیحیوں کو یہ بھی واضح کرنا چاہئے کہ وہ شریعت کی عدم موجودگی میں گناہ کی تعریف کیا اور کیسے کرتے ہیں؟ دیگر مسیحیوں کے برعکس مسیانکس شریعت کی تنسیخ تسلیم نہیں کرتے بلکہ اسے لاگو مانتے ہیں اس لیے ان سے یہ سوال تو نہیں کیا جا سکتا کہ وہ گناہ کی تعریف شریعت کی عدم موجودگی میں کیا کرتے ہیں البتہ ان سے یہ سوال پوچھنا مناسب ہے کہ شریعت کی موجودگی میں یسوع مسیح کی آمد کے بعد وہ دور فضل سے کیا مراد لیتے ہیں؟ (کیونکہ ان کا دعویٰ ہے کہ دور فضل بے شرع نہیں ہوتا) چونکہ شریعت موسی کو ودیعت کی گئی تھی اس لیے مسیانکس موسیٰ اور مسیح دونوں کے ادوار میں شریعت کی موجودگی میں موسوی دور میں عدم فضل اور عیسوی دور میں فضل کا وجود کیسے پاتے ہیں؟

سادہ سے الفاظ میں یہ سوال یوں بھی کر سکتے ہیں کہ شریعت کی موجودگی میں موسیٰ اور یسوع مسیح کے ادوار میں فضل کے لحاظ سے کیا فرق موجود ہے؟

ہمیں کفارہ کے لیے یسوع مسیح کے شاگردوں کا طرزِ عمل دیکھنے کی کوشش کرنی چاہئے کیا انہیں یسوع مسیح کی صلیبی موت کے وسیلے سے کفارہ کا کچھ علم تھا؟ اگر انہیں یہ علم ہوتا کہ مرشد کی صلیب پر موت گناہوں سے نجات دلانے کی ضامن ہے تو پھر (ا) یہوداہ اسکریوطی کو (بقول انجیل نویس) خودکشی کرنے کی ضرورت ہی کیوں پڑتی؟ یسوع مسیح کی تصلیب کے ساتھ ہی انہیں ان کے گناہ سے معافی دستیاب ہو جاتی اور یوں انہیں پچھتاوے میں جان دینے کی ضرورت ہی نہیں رہتی. زیادہ سے زیادہ انہیں یسوع مسیح پر ایمان لانا پڑتا یا اپنے گناہ کا فقط اپنے منہ سے اقرار کرنا پڑتا. اس سے زیادہ کی ضرورت ہی نہیں تھی ایمان تو وہ پہلے ہی لا چکے تھے اور گناہ کا اقرار کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا مسیحی دوست اس کے جواب میں شاید کچھ نہ کچھ تاویل کرنے کی کوشش کریں کہ یسوع مسیح نے یہوداہ اسکریوطی کے اس فعل بد پر اظہارِ افسوس فرمایا تھا یا یہوداہ اسکریوطی نے اپنے فعل بد پر اظہارِ ندامت کرتے ہوئے یہ قدم اٹھایا لیکن اس عذر کا جواب دو طرح سے دیا جا سکتا ہے:

اول: یسوع مسیح نے ان کے برے فعل کی مذمت کی تھی لیکن انہیں زمرہ ایمان سے خارج نہیں کیا تھا یسوع مسیح کو گرفتار کروانا زیادہ سے زیادہ گناہ تو شمار ہو سکتا ہے لیکن ارتداد نہیں یہ ایسے ہی ہے کہ ایک شخص ریاستی قانون توڑنے کے باوجود ریاست کا شہری ہی رہتا ہے درآنحالیکہ اسے اس جرم میں مستوجب سزا بھی گردانا جاتا ہے. اگر ریاست کسی شہری کے جرم کو اس قدر شدید تصور کرے کہ گویا اس نے ریاستی اساس منہدم کر دی تو پھر باقاعدہ حکمنامہ جاری کر کے اس مجرم کو ریاستی حقوق سے محروم کیا جاتا ہے لیکن یہوداہ اسکریوطی کے کیس میں بھی ایسا کچھ

ثابت نہیں، انہیں غیر مؤمن تو کسی نے بھی نہیں کہا حتی کہ خود یسوع مسیح نے بھی نہیں اور مسیح کو پکڑوانا اگر ایک طرف گناہ تھا تو دوسری طرف مسیح کی صلیبی موت اس گناہ کا کفارہ بھی ہونا چاہیے تھی اگر انجیل کا بیان یہوداہ اسکریوطی کی موت کے متعلق درست ہے تو پھر عقیدہ کفارہ کی نفی تو خود بخود ہو جاتی ہے کہ شاگرد ایسی کسی بشارت سے بے خبر تھے۔

دوم: یسوع مسیح نے تو مرنے کے بعد قیدی روحوں میں بھی گناہوں کی معافی کی منادی کی تھی تو یہوداہ اسکریوطی معافی کے مستحق کیوں نہ ٹھہرے؟ یسوع مسیح نے دوبارہ جی اٹھنے کے بعد بھی یہوداہ اسکریوطی کی رسالت ختم یا تبدیل کرنے کے لئے کوئی ہلکا سا اشارہ بھی نہیں کی۔

(۲) خود پطرس بقیہ گیارہ رسولوں سمیت یسوع علیہ السلام مسیح کا مردوں میں سے جی اٹھنا مہمل کیوں خیال فرماتے؟ (لوقا 24:11) اگر شاگردوں کو یسوع مسیح نے ادنی سا درجے میں بھی اس بشارت سے آگاہ فرمایا ہوتا تو کسی کے ذہن میں ایسا خیال آ ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ اس ایسی صورت میں تو انہیں تدفین مسیح کے بعد منتظر ہونا چاہئے تھا کہ وہ مُردوں میں سے جی اٹھیں تا کہ عمل کفارہ مکمل ہو جائے۔ بعد کی تاویلات محض طفل تسلیاں ہیں اور معصوم مبائعین کو مطمئن کرنے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں۔

مذکورہ بالا بحث سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ یسوع مسیح کے شاگردوں میں سے کوئی ایک بھی نہیں جانتا تھا کہ یسوع مسیح کی تصلیب ان کے موروثی یا شخصی گناہوں کے کفارہ کی خاطر ہے۔

قدرتی طور پر یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس تعلیم کا تعلق اگر یسوع مسیح سے نہیں تو پھر یہ آئی کدھر سے؟ اس کا جواب ہم پولوس کے خط (۲) تیموتاؤس 2:8 میں پاتے ہیں:

”خداوند یسوع مسیح جو داؤد کی نسل سے ہے میری اس انجیل کے موافق مُردوں سے زندہ کیا گیا ہے جس کے لئے میں دکھ اٹھاتا ہوں“۔

اپنے پیغام کو پولوس ایک ایسا بھید قرار دیتے ہیں جو پہلے لوگوں سے پوشیدہ رہا لیکن ان پر ظاہر کردیا گیا:

''میں خدا کے کلام کی منادی کروں یعنی اس بھید کی جو زمانوں اور پشتوں سے پوشیدہ رہاہے لیکن اب اس کے مقدسوں پر ظاہر ہوا ہے''(کُلسیوں 1:26)

یہاں چابک دستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مقدسین کا نام لیا گیا ہے تاکہ ان کی تعلیم کو اجتماعی طور پر سمجھا جائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان مقدسین سے مراد وہ اکیلے خود ہی ہیں. ان کے علاوہ کون ہے جس پر یہ بھید آشکار ہوا؟ وہ واشگاف الفاظ میں یہ بھید خود پر منکشف کئے جانے کی بات کرتے ہیں:

''تم خدا کے اس فضل کی مختاری سے آگاہ ہوئے ہوگے جو مجھے تمہاری خاطر دیا گیا کہ وہ بھید مجھے انکشاف سے بتایا گیا''۔(افسیوں 3:2)

اگرچہ بعد میں وہ اس بھید میں دوسرے رسولوں کو شامل کرنے کی بات کرتے ہیں لیکن یہ خلاف واقعہ ہے. کیا انہوں نے ہی دوسرے رسولوں کو اس تعلیم سے آگاہ کیا تھا؟ اس کا جواب اثبات میں ہونا چاہیے کیونکہ وہ غلاطیوں کے خط میں اس بات کی مکمل نفی کرتے ہیں کہ انہوں نے دیگر رسولوں سے کچھ تعلیم پائی تھی (غلاطیوں 2:6) یعنی کہ عقیدہ کفارہ انہیں رسولوں سے نہیں ملا بلکہ انہوں نے خود دوسروں کو تعلیم کیا دیگر رسولوں کا نام پولوس کی تعلیم پر اعتبار دلانے کے لیے تبرکاً ٹانک دیا گیا ہے جس کی تصدیق کی کوئی صورت ان کے پاس نہیں تھی جنہیں یہ تعلیم دی جارہی تھی. اس کے علاوہ وہ یہ بھی صاف صاف اقرار کرتے ہیں کہ جو انجیل وہ سنا رہے ہیں وہ ان (پولوس) کی ہے جو انہیں براہ راست مکاشفہ کے ذریعے ودیعت ہوئی ہے۔(غلاطیوں 1:12 / رومیوں 15:18) وہ اپنی تعلیم مؤثر اور یسوع مسیح کی واحد نمائندہ تعلیم بنانے کے لیے دیگر تمام پیغامات کو رد کردیتے ہیں۔(غلاطیوں کے نام)

پس ہم بلا خوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ کفارہ کا عقیدہ مسیح کے برسوں بعد کی پولوسی ایجاد ہے مسیح کی تعلیم نہیں۔

فصل دوم عقیدہ تجسیم

عقیدہ کفارہ پر اختصار سے اظہار خیال کے بعد ہم مسئلہ تجسیم پر آتے ہیں۔

مسیحیت تجسیم الٰہی کا عقیدہ رکھتی ہے جس میں خدا نے انسانی جسم اختیار کر کے زمینی بود و باش اختیار کر لی، اس معاملے میں مسیحی برادری نہایت ژولیدہ خیالی کا شکار ہے طرح طرح کے عقائد ہیں اور طرح طرح کی تاویلات. غیر مسیحی اعتراضات سے نمٹنے کی خاطر تاویلات کی پٹاری کھول لی جاتی ہے لیکن حسبِ معمول اتفاق رائے عنقا ہے. کوئی یہوواہ کو مجسم مانتا ہے (مسیانکس) تو کوئی فقط خدا بیٹا کو (تثلیثی) اور کچھ لوگ تو یہوواہ کی تجسیم کو بدعت سمجھ کر میکائیل فرشتہ کی تجسیم کے قائل ہیں (یہوواہ وٹنس) کچھ لوگ اسے خدا کی تجسیم جانتے ہیں تو کچھ کے ہاں مسیح مخلوق تصور ہوتے ہیں۔غرض جتنے منہ اتنی باتیں

اگر یہ عقیدہ الہامی اور حقیقی ہوتا تو پھر یہ اتنا مختلف الرائے نہیں ہوتا کم ازکم یہ اتفاق تو پایا جاتا کہ کون سی ذات مجسم ہوئی بے شک تشریح میں فرق ہوتا لیکن اصل بنیاد تو ایک ہی رہتی لیکن ایسا کچھ نہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ نظریہ المسیح کا دیا ہوا نہیں بلکہ بعد کی پیداوار ہے جس پر اتفاق رائے ممکن نہیں رہا. اگر مسیحی عقیدہ تجسیم درست ہے تو پھر یہ بھی تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ تجسیم الوہیت سے بشریت کی طرف سفر ہے جو کہ عروج سے تنزلی پر اختتام پذیر ہوا. اس تجسیم کی ایک ہی غرض وغائت بتائی جاتی ہے اور وہ ہے گناہوں کی معافی کے جان دینے کا عزم وعمل. اگر مسیحی تھیالوجی میں خدا اتنا ہی بے اختیار ہے کہ وہ انسان بنے بغیر اور دوسروں کے ہاتھوں تحقیر و تذلیل کروا کر موت قبول کئے بغیر معافی دینے کی اہلیت یا اختیار سے عاری ہے تو پھر ایسا خدا کسی

کا مواخذہ کیسے کرسکتا ہے یا کیسے مختار کل کہلا سکتا ہے؟ کیا کوئی انسان وہاں (عدالت میں) اپنے گناہوں کی معافی کی خاطر خدا سے مرنے کا مطالبہ نہیں کرسکتا؟ اور اگر کرے تو خدا کے انکار کا باعث کیا ہوگا؟ پس یہ تصور ہی مضحکہ خیز ہے کہ انسان کو معافی اور نجات دینے کے لیے خدا کو مرنا پڑا. دراصل یہ نظریہ بالکل اسی انداز میں انسانی خیالات کے تابع وضع کیا گیا ہے جیسے دیگر بت پرستانہ مذاہب اختراع کئے گئے ہیں. مسیح مجسم ہوکر آنے کا کوئی دعویٰ نہیں کرتے لیکن بعد میں ان سے منسوب کردیا گیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ مسیحی برادری یسوع مسیح کی صورت میں جس تجسیم الہی پر ایمان رکھتی ہے اس کا خود یسوع مسیح اور عہد قدیم سے کیا تعلق و رشتہ ہے؟ کیا یہ تعلیم واقعی یسوع مسیح نے مقدس نوشتوں کے مطابق دی ہے یا یہ خودساختہ انسانی تعلیم ہے جس میں فقط یسوع مسیح کا اسم مبارک استعمال ہوا ہے اور نام کے علاوہ اس تعلیم کا یسوع سے کچھ تعلق نہیں؟ اس سوال کا جواب مندرجہ ذیل نکات مدنظر رکھتے ہوئے دیا جانا چاہیے:

(۱) کلام مقدس کے اولین امین یہودی تجسیم الٰہی کے متعلق کیا نظریہ رکھتے تھے؟

(۲) کیا ان کے تجسیمی نظریہ کی یسوع مسیح نے تائید وتصویب کی یا تغلیط واصلاح کی؟

(۳) کیا یسوع مسیح نے اپنے آپ کو خدا کی تجسیم بتایا یا ان کے اقوال کو توڑ مروڑ کر ان سے مطلب براری کی جاتی ہے؟

(۴) اگر یسوع مسیح نے خود کو خدا کی تجسیم بتایا تو عہد قدیم کے کون کون سے مقامات اپنے دعوے کے تائید میں یہودیوں کے سامنے رکھے؟

(۵) کیا یسوع مسیح سے خود کوئی ایسا دعوی منسوب کر کے اس پر خود سے کوئی عقیدہ کھڑا کر لینا واقعی مسیح کی اصلی تعلیم کہلا سکتا ہے؟

(٦) کیا توحید پر ایمان رکھتے ہوئے تجسیم الٰہی کا عقیدہ رکھا جا سکتا ہے؟

مسیحی برادری میں اس وقت جو تثلیث بیزاری کی مہم زور پکڑتی دکھائی دے رہی ہے یہ اس لحاظ سے خوش آئند ہے کہ وہ بنیادی ابراہیمی چشمہ توحید کی طرف مراجعت کرتی نظر آتی ہے لیکن اس ضمن میں جو مباحث ہو رہے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منزل ابھی کافی دور ہے کیونکہ شرک کی بنیادی جڑ عقیدہ تجسیم کو ترک کرنے پر آمادگی کہیں نظر نہیں آتی. ہمیں ان مسائل اور مشکلات کا بھی ادراک ہے جو صدیوں سے جمے جمائے ایسے مخصوص عقیدہ جو خون کی طرح انسانی رگوں میں دوڑ رہا ہو پر گفتگو کرتے ہوئے پیش آتی ہیں. یقیناً ناممکنات کی حدود کو چھوتے عقیدت وغلو کے بت توڑنا اور محنت شاقہ سے صحیح نتائج نکال کر انہیں پوری شرح صدر سے قبول کرنا ایک کٹھن مرحلہ ہوتا ہے بعض لوگ تو درست نتائج کے انتہائی قریب پہنچ کر بھی اس خوف سے آزاد نہیں ہو پاتے کہ مبادا وہ کہیں ان نتائج کو اخذ کرنے میں کسی غلطی کا شکار نہ ہو رہے ہوں اور اسی خوف سے حقیقت قبول کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں. یقیناً ایسی احتیاطی سوچ اخلاص کی مظہر ہوتی ہے لیکن یہ التزام بھی ضروری ہے کہ روایتی احتیاط کسی بھی طرح صحیح نتائج کے قبول کرنے میں رکاوٹ نہ بن جائے کیونکہ حتمی فیصلہ بہرحال فرد نے خود ہی کرنا ہوتا ہے کہ فطرت نے یہی اصول متعین کیا ہے. نیک نیتی سے کیا گیا ایسا فعل جو جرم یا فساد فی العقیدہ کے زمرے میں آتا ہو، کسی کو جوابدہی سے مستثنٰی نہیں کرتا ہمیں ان سوالات کے دیانت دارانہ جوابات تلاش کرنے چاہئیں:

سوال ا: کیا خدا تعالٰی مجسم ہو کر انسانی بدن اختیار کر سکتا ہے؟ اور کیا اس نے ایسا کیا ہے؟ یہ گفتگو ممکنات اور وقوع پذیر معاملات میں فرق روا رکھتے ہوئے ہونی چاہیے. اگر امکانات کے سہارے پر تکیہ نہ کیا جائے اور حقائق پر مبنی دلائل کو اولیت بخشی جائے تو درست نتیجہ برآمد ہوگا وگرنہ نہیں۔

سوال ۲: کیا خدائے برتر کی تجسیم قدرت سے عدم قدرت، اعلی سے ادنی، فائق سے مفوِق، خالق سے مخلوق، حاکم سے محکوم، معاط سے معاطی، زندگی سے موت کی طرف سفر نہیں؟ کیا خدا کو ایسے تجربہ کی ضرورت تھی؟

سوال ۳: عہد جدید کی جن کتب سے تجسیم کے دلائل فراہم کئے جاتے ہیں، کیا ان سے توحید خالص، جو عہد قدیم سے عیاں ہوتی ہے، کا اثبات ممکن ہے؟ اگر اثبات ممکن ہے تو پھر اس امر کا پتہ چلانا پڑے گا کہ ایسے ہی کلامی مباحث سے عمائدین کلیسیا انہی کتب سے تثلیث برآمد کرتے وقت استدلال میں اپنے فہم میں کہاں غلطی کھا گئے اور ان کے برآمد شدہ نتائج اب کس طرح رد کئے جائیں گے؟ اور آپ باوجود عقیدہ تجسیم اپنانے کے، جدید استدلال (نفی تثلیث) میں کیوں باصواب ہیں؟

سوال ۴: کیا عقیدہ تجسیم پر کاربند رہتے ہوئے عقیدہ توحید اپنانا ممکن ہے؟ اس سوال کا جواب اس تناظر میں دیکھنا ہوگا کہ جس ہستی میں خدا مجسم ہوگا، کیا وہ ہستی بھی باوجود بشر ہونے کے، اب خدا ہے یا نہیں۔ اس کے دو ممکنہ پہلو ہیں۔ پہلا پہلو تو یہ ہے کہ وہ ہستی خدا ہے (جیسا کہ عمائدین کلیسیا نے سمجھا) ایسی صورت میں خدا باپ اور خدا بیٹا میں تمیز کرنا پڑے گی کیونکہ انجیل کے مطابق خود مسیح نے بحیثیت خدا بیٹا یہ تمیز خدا کو باپ کہہ کر کی ہے اور یہ ناممکن ہے کہ وہ خود کو ہی خود کے سامنے بہ حیثیت عابد پیش کر رہے ہوں یعنی کہ عابد و معبود کا ایک ہی ہستی میں اجتماع عقیدہ توحید کے منافی ہے اور اجتماع ضدین ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ایسی ہستی خدا نہیں ہے لیکن اس پہلو کو اپنانے سے اس سوال کا جواب دینا لازم ہو جاتا ہے کہ کیا خدا نے تجسیم اختیار کرتے وقت الوہیت سے علیحدگی اختیار کر لی تھی؟ کیا خدا اپنی الوہیت سے کسی وقت مستعفی ہو سکتا ہے اور پھر کسی دوسرے وقت اسے دوبارہ قبول کر سکتا ہے؟ یہ صورت یقیناً خدا کی کاملیت

پر کڑے سوال اٹھاتی ہے جن سے محض عقیدت کی وجہ سے اعراض نہیں کیا جا سکتا۔

سوال ۵: اگر اجتماع ضدین مان بھی لیا جائے تو تب مسیح کی دو فطرتی ہستی کو تسلیم کرنا پڑے گا حالانکہ فطرت تو ایک ہی ہوا کرتی ہے. یعنی کہ اس لحاظ سے بھی تجسیم ناممکنات میں آ جاتی ہے. مسیح کے دو فطری اعتقاد پر ہی تو تثلیث وجود میں آئی تھی تو پھر مسیح کی دو فطرتیں تسلیم کر کے کس طرح توحید پر قائم رہا جا سکتا ہے؟ یعنی بنیادی شرک تو اپنی جگہ قائم و موجود ہے یعنی جو بھی شخص توحید اپنانا چاہتا ہے اسے لازماً عقیدہ تجسیم کا انکار کرنا پڑے گا۔

سوال ٦: اگر مسیح کی دو فطرتیں تسلیم کر لی جائیں تو یہ سوال تو عقیدہ تجسیم پر غور کے لئے انتہائی اہم ہے کہ کیا صلیب پر موت الوہیت کو آئی تھی یا بشریت کو؟ اگر الوہیت کو آئی تھی تو پھر یقیناً کفارہ کا مقصد بہت خوب انداز میں پورا ہوا لیکن ساتھ ہی ساتھ خدا کا مرنا بھی لازم آیا جس سے اس کے ازلی و ابدی ہونے کے دونوں پہلوؤں کی نفی بخوبی ہوگئی. ایسا خدا کس طرح ایک حقیقی خدا کی صفات سے متصف ہے؟ لیکن اگر یہ عذر باندھا جائے کہ بشریت کو موت آئی تھی تو پھر تجسیم کا مقصد ہی پادرِ ہوا ہوا جاتا ہے کیونکہ معتذر نے خود ہی تسلیم کر لیا کہ موت ایک انسان کو آئی. اس صورت میں تو کسی بھی فرد کو ممتاز حیثیت عطا کر کے اس سے مقصد کفارہ حاصل کیا جا سکتا تھا اور اس کے لیے کسی بھی طرح تجسیم الٰہی ضروری ہی نہیں تھی۔

سوال ۷: اگر مسیح کو نبی سے بڑھ کر کچھ باور کرنے کی بجائے ابن آدم ہونے کے ناتے محض ایک انسان ہی تسلیم کرتے ہوئے انہیں دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کی مانند خدا کا برگزیدہ نبی ہی مانا جائے تو کیا قباحت لازم آتی ہے؟ کیا اس سے توحید کے متعلق مسیحی تھیالوجی میں موجود سارے مسائل حل نہیں ہو جاتے؟

سوال ۸: مسیحی تھیالوجی مسیح کو ایک انسان تسلیم کرنے میں کس مشکل کا سامنا کرتی ہے؟

سوال ۹: تجسم اور تمثل میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو مثال دے کر وضاحت کریں اور اگر نہیں تو اس کی دلیل کیا ہے؟

فصل سوم عقیدہ تثلیث

جب غلو اور کلام مقدس کی غلط تشریحات سے یسوع مسیح کو پیغمبرانہ منصب سے اٹھا کر الوہیت پر فائز کر دیا گیا تو پھر ایسے بہت سے سوالوں کے جواب دینے کی ضرورت پیش آئی جو ایک انسان کو الٰہ قرار دینے سے سامنے آئے۔ سب سے پہلے مسیح کو خدا کا ہم جوہر قرار دیا گیا اور اس کے بعد ہم ارادہ اور بالآخر بائبل کی تعلیم کے صریحاً منافی انہیں خدا کا ہم مرتبہ بنا دیا گیا. اس کے بعد قدرتاً یہ سوال اٹھتا تھا کہ جب باپ بھی خدا ہے اور بیٹا بھی ہم جوہر اور ہم ارادہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہم مرتبہ بھی ہے تو پھر وہ خدا کیوں نہیں. اب اگر باپ کو بھی خدا کہیں اور بیٹے کو بھی تو پھر اس شکل میں دو خدا وجود میں آنے کا تنازعہ پیدا ہوتا تھا یعنی کہ توحید جو توریت شریف کی مستحکم تعلیم ہے اور یسوع مسیح بھی اسی کے پرچارک عنقا ہو رہی تھی. پس مشرکانہ عقیدہ تجسیم کے غیر الہامی ہونے کے الزام سے بچنے اور وحدانیت سے چمٹے رہنے کے لئے تثلیث فی التوحید کی اصطلاح وضع کی گئی اور خداؤں کی کثرت کو صفات کی کثرت میں تبدیل کر کے اقانیم ثلاثہ ایجاد کئے گئے اور بیٹے کو اس خدائی مجلس کا اقنوم ثانی قرار دے کر توحید کے پردے میں شرک کو عقیدہ بنا لیا گیا تاہم یہ کام اتنی آسانی سے بھی نہیں ہوا بلکہ بعض دیگر مباحث سلجھانے میں مزید تیرہ صدیاں لگ گئیں. سوال تو اہلِ تثلیث سے پوچھنا یہ بنتا ہے کہ کیا خدا کی صفاتِ کثیرہ اس بات کو مستلزم ہیں کہ اس میں شخصیات کثیرہ بھی ہوں؟ کیا اکیلا واحد خدا صفاتِ کثیرہ پر اقانیم کثیرہ کے بغیر قادر نہیں ہوسکتا؟ اگر پہلے سوال کا جواب نفی میں اور دوسرے کا اثبات میں ہو تو پھر تثلیث کی ضرورت ہی کیا تھی جو اسے ایجاد کرنا پڑا؟ (اثبات سے مراد دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ

خدا اکیلا واحد بھی صفات کثیرہ کے استعمال پر قادر ہے) کیا اہل تثلیث بتائیں گے کہ اقانیم ثلاثہ نے خدائی صفات کو باہم منقسم کر رکھا ہے یا نہیں؟ اگر منقسم کر رکھا ہے تو پھر خدائی اختیارات ایک الوہی کونسل کے پاس ہوئے نہ کہ واحد ذات کے ہاتھ میں لیکن اگر یہ کہنا غلط ہے تو پھر سوال وہی کھڑا ہو جائے گا کہ جب ایک ہی ذات یہ اختیارات استعمال کرنے پر قادر ہے تو اقانیم کثیرہ کی کیا ضرورت تھی؟

اصل دریافت طلب امر یہ ہے کہ یہ مسیحی دعویٰ کہ تثلیث کے اقانیم ثلاثہ دراصل ایک ہی خدا کے تین اقنوم ہیں جنہیں غیر مسیحی سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے، کس قدر معقول اور قابلِ قبول وفہم ہے؟ اگر ان کا یہ دعویٰ کسی حیل حجت کے بغیر آنکھیں بند کر کے تسلیم کر لیں تو پھر بھی بہت سے سوالات اٹھتے ہیں مثلاً:

(۱) کیا یہ اقانیم ہر وقت یکجا رہتے ہیں یا کبھی کبھی یکجا ہوتے ہیں؟

(۲) اگر یکجا ہیں تو پھر خدا بیٹا یسوع خدا باپ کے دہنی طرف کیسے بیٹھا ہے جب تک ان کے مابین مغائرت نہ ہو؟ ان کی یکجائی کی فقط یہی صورت ہے کہ بیٹا باپ کے ساتھ ملحق ہو اور اس صورت میں دائیں بیٹھنے کا معاملہ وقوع پذیر نہیں ہو سکتا. پس اس صورت میں انجیل اور پوادر میں زبردست تضاد پایا جاتا ہے تو پھر یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ سچا کون ہے، انجیل یا یہ پوادر؟

(۳) اگر ہمہ وقت یکجا رہتے ہیں تو کیا صلیب پر تینوں موجود تھے؟ اگر تینوں موجود تھے تو کیا بوجہ اتحاد تینوں کو موت آئی تھی؟ یعنی کہ باپ بھی موت سے ہمکنار ہوا تھا؟ اگر ہوا تھا تو اسے کس نے زندگی بخشی اور اگر نہیں مرا تھا تو پھر خدائی مجلس کا اتحاد کیسے باقی رہا کہ ایک اقنوم مر گیا جبکہ دو زندہ رہے؟

(۴) دو اقنوم زندہ رہے اور ایک مر گیا تو کیا یہ الگ الگ خدا نہیں ٹھہرے؟ اور الگ الگ

خدا اپنا الگ الگ ارادہ کیوں نہیں رکھتے جبکہ دوسرا اقنوم مرنے کا ارادہ کئے ہوا تھا اور پہلا اقنوم دوسرے کو موت سے ہمکنار کرنے کا؟ وہ اپنے ارادے میں باہم کیسے متفق ہیں اور وجہ اتفاق کیا ہے؟ اصولاً یا تو دونوں مارنے پر متفق ہونے چاہئیں تھے یا مرنے پر کہ پھر ہی ہم ارادہ سمجھے جا سکتے ہیں۔

(۵) کیا اقانیم ثلاثہ ہی متجسد ہوئے تھے یا فقط اقنوم ثانی؟ جب اقنوم ثانی متجسد ہو کر زمین پر تھا تو دیگر دو اقنوم کہاں تھے اور ان کے اتحاد کی صورت اور نوعیت کیا تھی؟

(۶) اگر مسیحی دعویٰ تثلیث تسلیم بھی کر لیا جائے تو پھر بھی خدائی جمعیت کے ارکان ثلاثہ از روئے انجیل مساوی المرتبہ نہیں ہیں جبکہ پوادر انہیں ہمسر قرار دیتے ہیں۔اس معاملے میں کسے سچا تسلیم کریں، انجیل کو یا پوادر کو؟ (انجیل یوحنا میں خدا بیٹا اقرار کرتا ہے کہ بھیجنے والا سینئر ہے اور بھیجا جانے والا جونیئر)۔

مسیحیوں کے مطابق تثلیث کے تین رکن ہیں: باپ، بیٹا اور روح القدس، ان میں یسوع اقنوم ثانی کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ کامل انسان اور کامل خدا ہے۔اب چونکہ یسوع ہی خدا بیٹا ہے تو پھر کیا اس صورت میں یہ باپ اور روح القدس سے جوہر اور حیثیت میں الگ نہیں ہو گیا کیونکہ باپ اور روح القدس کامل خدا اور کامل انسان نہیں ہیں؟ ہم مسیحی دوستوں سے سنا کرتے ہیں کہ تثلیث دراصل اقانیم ثلاثہ اول خدا باپ دوم خدا بیٹا اور سوم خدا روح القدس سے عبارت ہے۔سوال یہ ہے کہ:

(۱) جب خدا کی کاملیت اقانیم ثلاثہ کے ذریعے سامنے آتی ہے تو پھر ہر ایک اقنوم اپنی اپنی جگہ پر ناقص کیوں نہیں کہ ناقص اقانیم ثلاثہ مل کر ایک کامل خدا بنتے ہیں؟

(۲) لیکن اگر ہر اقنوم اپنی اپنی جگہ پر کامل خدا ہے تو پھر تثلیث اقدس کیوں تین کامل

خداؤں کی الوہی مجلس نہیں؟

(۳) اگر اقانیم ثلاثہ اپنی اپنی جگہ پر کامل خدا ہیں تو پھر انہیں تثلیث میں باہم جمع ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اگر ہر اقنوم الگ حیثیت رکھتا ہے اور اپنی جگہ پر کامل خدا بھی ہے تو پھر تینوں باہم مل کر ایک خدا کیسے ہوسکتا ہے؟ انہیں تو تین خدا ہونا چاہیے لیکن اگر تثلیث میں مجتمع ہوئے بغیر یہ خدا یا کامل خدا نہیں کہلا سکتے تو پھر ہر اقنوم اپنی اپنی جگہ پر کامل خدا کیسے ہوسکتا ہے؟

قصّہ مختصر کہ تثلیثی تعلیم یسوع مسیح کے بعد میں اختراع کی گئی ایک فلسفیانہ موشگافی ہے یسوع مسیح کی فرمودہ نہیں۔ پادری صاحبان بات شروع خدا کی صفاتِ کثیرہ سے کرتے ہیں اور ختم اقانیم پر کرتے ہیں اب یہ مغالطہ کون دور کرے گا کہ کیا خدا کی صفات اقنوم یعنی کہ ہستی یا ذات ہوا کرتی ہیں؟ اگر صورتحال یہی ہے تو یہ سوال بھی پوچھا جانا چاہئے کہ کیا خدا کی تین صفات ہی اقانیم میں ڈھل سکیں اور دیگر صفات ان اقانیم سے منسلک رہیں؟ یہاں یہ بھی پوچھنا پڑے گا کہ کیا خدا کی یہ دیگر صفات اقانیم ثلاثہ مل کر استعمال کرتے ہیں یا ہر اقنوم اپنی اپنی جگہ پر الگ الگ صفات کا اظہار کرتا ہے. مثلاً کیا دعا صرف باپ ہی سن سکتا ہے جیسا کہ مسیحی دعامیں کہتے ہیں یا بیٹا بھی یا روح القدس بھی؟ یا مسیحی مومنین کی دستگیری صرف روح القدس ہی کرتا ہے اور دیگر اقانیم نہیں؟ کیا مسیحیوں کے گناہ معاف کروانے کے لیے صرف بیٹا ہی جان دے سکتا ہے اور دیگر اقانیم نہیں؟

دراصل تثلیث ایک پیچیدہ اور بدیہات کے منافی ایک عقیدہ ہے جسے کسی بھی طور سمجھا نہیں جاسکتا البتہ آنکھیں بند کر کے قبول ضرور کیا جاسکتا ہے اور وہ بھی اس وقت جب عقل سلیم استعمال نہ کرنے کا فیصلہ اور حوصلہ کرلیا جائے۔ تثلیث کے عقیدہ کی کسی بھی نبی نے کبھی تعلیم نہیں دی عہد قدیم میں خدا بھی ایک ہی ہے اور اس کا اقنوم بھی ایک ہی ہے. کب کس نبی نے ابن کے اقنوم کی عبادت کی طرف دعوت دی؟ پوری بائبل شریف درساً درساً تلاوت کر لیجئے اس سوال کا جواب

نہیں ملے گا۔تثلیث کے حق میں جتنے بھی دلائل مسیحی برادری کی جانب سے دیئے جاتے ہیں ان میں سے ایک بھی الہامی کتاب سے اقتباس نہیں کیا گیا ہوتا بلکہ فلسفیانہ نکتہ آفرینیاں ہی ان دلائل کی جان ہوتی ہیں۔سوال یہ ہے کہ کیا یسوع مسیح بحیثیت یہودی فرد توریت شریف سے اپنا عقیدہ لیتے یا یونانی فلاسفہ سے؟ قابل غور بات یہ ہے کہ عملاً جب یسوع مسیح انسانی تعلیم اور روایت کی پیروی کی مذمت نہایت سخت الفاظ میں فرماتے ہیں تو پھر وہ کس طرح الہامی تعلیمات کے خلاف جا کر فلسفیانہ تعلیم کا پرچار کرتے رہے اور اگر ایسا کیا تو پھر ان کی تعلیم توریت کے موافق کیسے رہی ؟ خلافِ توریت تصور خدا کو خود توریت شریف نہ صرف رد کرتی ہے بلکہ ایک قابلِ سزا بدی اور شرارت قرار دیتی ہے (استثناء باب 13) تو پھر یسوع اس کے خلاف کیسے جاتے؟ یہودی ایسی کسی خدائی جمعیت سے واقف نہیں ہیں جسے بعدازاں مسیحی تھیالوجی کی جان بنا دیا گیا۔اگر یسوع مسیح ایسی کسی خلاف توریت تعلیم کی منادی کرتے تو کیا یہودیوں پر از روئے شریعت لازم نہ تھا کہ وہ بغیر ترس کھائے یسوع کو سزا دیتے اور یہ بدی اور شرارت اپنے درمیان سے دفع کرتے؟ اگر کوئی مسیحی اس تثلیث کی تعلیم پر یہ کہہ کر اصرار کرتا ہے کہ یہ یسوع مسیح کی ہی بات ہے تو پھر کیا یہ تعلیم خلافِ شریعت نہیں؟ اور کیا شرعی طور پر مجرم قرار دیئے جانے کے بعد سزا پانے والا کوئی شخص باعثِ نجات ہوسکتا ہے؟ یہ موت قربانی نہ ہوئی بلکہ شرعی سزا کا نفاذ ہوا اور یوں اصولاً مجرم کو مجرم ہی رہنا چاہیے بطل رشید نہیں۔

فصل چارم عقیدہ نجات

مسیحیت میں یسوع مسیح کی بعثت کا واحد مقصد لوگوں کو گناہوں سے نجات دلا کر ہمیشہ کی زندگی بخشنا مانا جاتا ہے۔مسیحی تھیالوجی میں نجات دلانے کے لیے کفارہ دینا لازم ہے اور کفارہ دینے کے لیے خدا کا مسیح کی ذات میں بطور انسان مجسم ہونا ضروری ہے اور تجسیم کے تثلیث کا

رکن ہونا ضروری ہے تاکہ ایک اقنوم دوسرے کی صلیب پر قربانی قبول کر کے بنی نوع انسان کو نجات دے سکے. یہ اعتقادات ایک زنجیری سلسلے کی مانند ایک دوسرے میں پیوست ہیں. مسیحیت میں آخری اور بنیادی مرحلہ نجات کا ہی ہے. اگر ہم نجات بذریعہ تصلیب مسیح (Soteriology) کے تصور پر نظر ڈالیں تو بہت عجیب وغریب صورتحال کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مسیحیت میں یسوع کا صلیب پر بہا خون ہی نجات کے لئے کافی ہے بشرطیکہ اس پر ایمان رکھا جائے. مسیحی نجات کے لئے تصلیب کا واقعہ خدائی منصوبہ قرار دیتے ہیں.؟ اگر یہ خدائی انتظام ہے تو پھر اس پر ایمان لانے کی شرط ہی احمقانہ ہے، کیوں؟ کیونکہ خدا نے جو بھی انتظام اس کائنات کے لئے کیا اسے بلاتفریق سب کے لیے رکھا ہے. خدا کی تمام نعمتیں ہر انسان استعمال کرتا ہے چاہے وہ خدا کو ماننے والا ہے یا منکر. اگر مسیحی تھیالوجی کے مطابق یہ کوئی خدائی منصوبہ ہے تو پھر ہر شخص کا استحقاق ہے کہ وہ اس سے مستفید ہو لیکن یہ کیسا الٰہی منصوبہ ہے کہ ہر شخص کو اس میں شامل ہونے کا کوئی حق نہیں دیا گیا اور نہ ہی کسی فرد کے ارادہ واختیار پر موقوف رکھا گیا بلکہ روز اول سے ہی طے کرلیا گیا کہ کون کون اس میں شامل کیا جائے گا یعنی کہ یہ طے شدہ تقدیر ہے۔ پولوس کے مطابق:

> ”خُدا نے تُمھیں (مسیحیوں کو) اِبتدا ہی سے اِس لِئے چُن لِیا تھا کہ رُوح کے ذرِیعہ سے پاکِیزہ بن کر اور حق پر اِیمان لا کر نجات پاؤ“۔ (2 تھسلنیکیوں باب 2)

جب خدا نے کسی شخص کو شروع سے کلیسیا میں داخلہ کے لئے نااہل سمجھ کر غیر منتخب رکھا گیا ہے تو پھر وہ کیسے نجات کے الٰہی منصوبے سے مستفید ہوسکتا ہے؟ کسی بات پر ایمان لانا یا نہ لانا کسی بھی فرد کی ذاتی صوابدید پر مبنی ہوتا ہے لیکن جب معاملہ چناؤ اور استرداد پر موقوف ہو تو پھر انسان کا اپنا ارادہ اور اختیار ختم ہوجاتے ہیں اور چناؤ کرنے والی ذات کے مرضی اور اختیار کے

تابع ہو جاتے ہیں. ارادہ و اختیار کے خاتمے کی صورت میں کس طرح سے کسی شخص سے ایمان لانے کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے یا ایمان نہ لانے کی صورت میں اس کا مواخذہ کیسے ہوسکتا ہے جبکہ اسے پہلے ہی روز سے نجات کے لئے چنا ہی نہیں گیا؟ یوں غیر مومن کا مواخذہ سخت ترین ناانصافی ہوگا کیونکہ ابتدائے آفرینش سے ہی وہ بغیر کسی وجہ کے پہلے ہی غیر منتخب مسترد شدہ ہے اور اسے اس حق سے محروم کر دیا گیا ہے. مسیحیت میں خدا محبت ہے خدا محبت کی بے جارٹ لگائی جاتی ہے لیکن انجیلی خدا کا کبھی بھی حقیقی منصفانہ طرزِ عمل سامنے نہیں آتا۔

مسیحی نجات کے لئے فرد کی جانب سے نیک اعمال کو لازم خیال نہیں کرتے لیکن نجات توہمات میں جکڑے جانے کا نہیں بلکہ ان زنجیروں کو توڑنے کا نام ہے. یہ تصور کتنا احمقانہ اور غیر منطقی ہے کہ صلیب پر جان کوئی دے اور جو جو اس تصلیب کو قبول کرتا جائے وہ گناہوں سے پاک ہوکر نجات حاصل کرتا جائے. ایک شخص دنیا میں ظلم کی انتہا کر دیتا ہے تو کیا وہ محض اس لئے احتساب سے ماوراء رہے گا کہ وہ اپنی کالی کرتوتوں کے باوجود ایک ایسے صلیبی واقعہ پر ایمان رکھتا ہے جو سیاسی الزام کے نتیجے میں وجود میں آیا؟ اس صورت میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا ایک بدکردار بھی فقط صاحب ایمان ہونے کی وجہ سے نجات کا حق دار بن سکے گا؟ یہی وہ مقام ہے جہاں تاویلات کا بھنڈار تو کھلتا ہے لیکن یک لفظی بامعنی نفی یا اثبات میں جواب کبھی نہیں ملتا. جب بھی کسی مسیحی کے سامنے یہ اعتراض کریں دلچسپ صورتحال جنم لے لے گی۔ فوراً یہ آیت نقل کی جائے گی کہ کیا تو نہیں جانتا ایمان بغیر اعمال کے مردہ ہے لیکن عملاً وہ اعمال کو لازم خیال نہیں کرتے کیونکہ وہ شریعت کو تکمیل کے نام پر منسوخ کر چکے ہیں اور خود کو تصلیب مسیح کے ساتھ شروع ہونے والے دور فضل میں سمجھتے ہیں جس میں شریعت کی قید اٹھا دی گئی تھی۔

دراصل یہ اجتماع ضدین کا خوبصورت مظاہرہ ہے ایک طرف انہیں نیک اعمال کی افادیت تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں مگر دوسری طرف اسی وقت اسی زبان سے نجات دلانے میں نیک اعمال

کی عدم ضرورت پر بھی زور دیا جاتا ہے. شریعت کو منسوخ بھی کہتے ہیں اور اس سے چمٹے رہنے کا ڈھونگ بھی رچاتے ہیں. اگر تصلیب مسیح سے دور فضل کا آغاز ہو گیا ہے اور ہم شریعت پر عمل کے اس لیے مکلف نہیں رہے کہ وہ منسوخ ہو گئی ہے تو پھر ہم کیسے فیصلہ کر سکتے ہیں کہ یہ عمل نیک ہے اور وہ عمل برا ہے؟ اگر اپنی رائے سے تو یہ بات ہر شخص کی جداگانہ رائے پر منحصر ہو جائے گی کہ وہ کسے نیکی سمجھتا ہے اور کسے بدی. لازمی نہیں کہ ایک فرد جس بات کو اچھا یا برا سمجھے دوسرا بھی اس کی موافقت کرے بلکہ اس کی رائے اس کے برعکس بھی ہو سکتی ہے. اگر مسیحی دوست یہ فرمائیں کہ اچھائی یا برائی ماپنے کا پیمانہ شریعت ہی ہے تو پھر وہ منسوخ کیسے؟ اگر دور فضل بھی ہے اور شریعت بھی ساقط نہیں تو پھر یہ دور فضل یسوع مسیح سے پہلے اس وقت کیوں نہیں تھا جب شریعت لاگو تھی؟ یسوع کی آمد کے بعد دور فضل میں بھی شریعت اگر لاگو ہے تو وہ دور پہلے دور سے کس طرح مختلف ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ پہلے دور میں نجات نہیں تھی جبکہ اب یسوع کے وسیلہ سے نجات حاصل ہو گئی ہے تو پھر پہلے کے لوگوں کو غیر نجات یافتہ تسلیم کرنا پڑے گا اور یہ کسی طور درست نہیں حتیٰ کہ بائبل کے بھی خلاف ہے. بائبل میں بعثت مسیح سے قبل بہت سے راستبازوں کا سلسلہ موجود ہے۔

شریعت کی منسوخی بھی ایک معمہ ہی ہے، یسوع مسیح نے کبھی بھی شریعت کی منسوخی کا مژدہ نہیں سنایا بلکہ وہ اس کی تکمیل پر زور دیتے رہے انہوں نے واشگاف الفاظ میں بتایا کہ وہ شریعت منسوخ کرنے نہیں آئے بلکہ اس کی تکمیل کرنے آئے ہیں. ان کے اس بیان کی کیا توجیہہ ممکن ہے اگر تکمیل کے نام پر منسوخی ہی مراد لی جائے؟ لامحالہ یسوع کے اپنے قول کی روشنی میں تکمیل سے مراد تنسیخ نہیں لی جا سکتی لیکن بدقسمتی سے مسیحیت میں یہی مراد لیا گیا ہے. ایسا کیوں ہوا؟ اگر بے جا عقیدت ترک کر کے محض حقائق کو مدنظر رکھیں تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ سب تعلیم ہے تو مسیح کے نام سے مگر خود ان کا اس سے کوئی تعلق یا سروکار نہیں. اس نظریاتی عمارت کے اصل

معمار پولوس ہیں جو یسوع مسیح تو کجا ان کے شاگردوں سے بھی کبھی فیض یاب نہیں ہوئے تھے اور انہوں نے ذاتی مکاشفہ کی بنیاد پر یہ سب مسیحیت میں داخل کیا ہے. یسوع نے ہرگز نجات کی وہ تعلیم نہیں دی جو مسیحیت آج ہمارے سامنے پیش کرتی ہے. جو بھی التباس پیدا ہوتا ہے وہ لفظ نجات سے پیدا ہوتا ہے جسے یسوع بھی استعمال کرتے ہیں اور پولوس بھی. یسوع کی تعلیم میں نجات صلیب پر بہے ان کے خون سے نہیں بلکہ توریت پر عمل پیرا ہونے سے ملتی ہے لیکن پولوس کے ہاں معاملہ مختلف ہے. سوچنے کی بات یہ ہے کہ یسوع کس قسم کی نجات دینے آئے تھے؟ یہودیوں کے ہاں نجات سے مراد ان کی دور داؤدی کی رفعت کی بحالی تھی اور کتاب مقدس بھی یہی تعلیم دیتی ہے لیکن مسیحیت میں نجات کا تعلق اس دنیا سے نہیں بلکہ مرنے کے بعد والی دنیا سے ہے. یہ بھی ایک بنیادی فرق ہے. توریت کسی بھی قسم کی اخروی زندگی کے تذکرہ یا اس وقت کسی جزا و سزا کے تصور سے قطعاً خالی ہے. اگر یہود میں یہ تصور بعد میں آیا بھی ہے تو یہ بابل کی اسیری کے دوران کا واقعہ ہے. یسوع نے اپنے متبعین کو کبھی مسیحی نہیں کہا تھا بلکہ وہ یا اس وقت ان کے پیروکار یہودیت سے الگ مذہب بنانے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے اور نہ ہی سوچا. مسیحیت دراصل یہودیت کے اندر ہی ایک اصلاحی تحریک تھی۔

مروجہ مسیحیت میں نجات کا فلسفہ انسان کو ہرگز اچھائی کی طرف مائل نہیں کرتا. جب گناہوں کا کفارہ پیشگی دیا جا چکا ہو تو گناہ کرنے میں کیا امر مانع رہے گا؟ مسیحی لازماً یہ کہیں گے کہ ہمیں کفارہ سے گناہ کرنے کا لائسنس نہیں ملا ہے لیکن گناہ کرنے سے قبل ہی اس کی معافی عطا ہونے سے کوئی گناہ کرنے سے کیوں رکا رہے گا؟ دوسری جانب یہ حقیقت بھی موجود ہے کہ جب کوئی شخص گناہ ہی نہیں کرتا تو پھر کفارہ کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

کیا انسان کو دنیا کا کوئی دین نجات نہیں دے سکتا:

مسیحی اس بات پر بہت نازاں ہوتے ہیں کہ مسیحیت انسان کو جیسے نجات عطا کرتی ہے دنیا کا کوئی اور دین ایسا نہیں کرتا. آیئے دیکھتے ہیں کہ مسیحی اپنے اس دعوے میں کہاں تک صادق ہیں . یہ جائزہ اسی وقت ثمر آور ہو گا جب ہم کچھ بنیادی سوالات کے جوابات تلاش کریں گے۔

نمبر۱: کیا نجات کا تعلق اس دنیا سے ہے یا حیات بعد الموت سے؟

(ا) مسیحیت میں حیات بعد الموت سے کیا مراد ہے؟

(ب) کیا یسوع کی آمد ثانی کے بعد سبھی لوگ تبدیل ہو کر جلالی جسم پالیں گے یا اسی فانی جسم کے ساتھ زندہ رہیں گے؟

(ج) یا پھر سبھی مر کر دوبارہ جی اٹھیں گے؟

(د) یا پھر یسوع کی ہزار سالہ بادشاہت کے بعد سبھی لوگ مریں گے اور پھر دوبارہ زندہ کئے جائیں گے اور ان کی عدالت ہو گی؟ آخر ہو گا کیا؟ عدالت کب ہو گی؟ واضح جواب درکار ہے۔

نمبر۲: کیا نجات فقط ایمان سے حاصل ہوتی ہے یا اعمال کا ساتھ بھی ضروری ہوتا ہے؟

(ا) اگر نجات کا تعلق اس دنیا سے ہے تو پھر آنے والی دنیا میں انسان اپنے کن اعمال و ایمان کا حساب دے گا جیسا کہ پولوس نے کہا (رومیوں 14:10) اور کیوں دے گا؟ کیا اس طرح سے یہ جزوی نجات نہ ہوئی جو بالآخر جواب دہی پر منتج ہوئی اور یوں ناقص رہی کیونکہ جواب دہی یا عدالت کے بعد اس کا بے فائدہ رہنا اظہر من الشّمس ہو گیا؟

(ب) اگر نجات کا تعلق آنے والی دنیا سے ہے اور ہم مسیحیت کے مطابق ابھی دورِ فضل میں زندہ ہیں تو پھر ہمارے کون سے اعمال کا احتساب ہو گا؟ اگر ہمارا احتساب ہو گا تو پھر نجات کا دعویٰ ناقص قرار پاتا ہے کیونکہ ہمیں نجات حاصل کرنے کے لیے نیک اعمال کی ضرورت پڑے گی. اس صورت میں دورِ فضل کا کیا فائدہ ہوا؟

(ج). ہم کس شریعت کی خلاف ورزی یا اطاعت پر سزا اور جزا پائیں گے کیونکہ شریعت تکمیل کے نام پر تعطیل پا چکی؟

نمبر۳ :اناجیل میں یسوع مسیح سے یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ عالم بالا میں لوگ فرشتوں کی مانند ہوں گے (متی 22:30) اس صورت میں ان نعمتوں کی کیا ضرورت باقی رہے گی جن کے متعلق پولوس کہتے ہیں کہ وہ ایسی ہیں کہ نہ آنکھوں نے دیکھیں اور نہ ہی کانوں نے سنیں؟ (1۔قرنتیوں 2:9)

(ا) یسوع کے اس فرمان کی موجودگی میں پولوسی قول کی کیا تاویل کریں گے؟

(ب) یسوع عذاب کے لیے تو جسمانی صورت تجویز کرتے ہیں (متی 13:42) لیکن انعام یا اجر کے لیے مومنین کو فرشتوں کی مانند بتا دیتے ہیں جو کہ ہر احتیاج سے پاک مخلوق ہیں. اس صورت میں یہ نعمتیں انسان کے کس کام کیں؟ (د) یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ جب نعمتیں محض تمثیلی ہوں گی (جیسا کہ مسیحی معتذرین کا دعویٰ ہے) تو پھر سزا جسمانی کیوں رہے گی جیسا کہ یسوع علیہ السلام مسیح فرماتے ہیں؟

(ج) اور اگر سزا بھی تمثیلی ہو گی تو پھر انسان اس سزا سے کیوں خوف زدہ ہو؟ (یعنی کہ یہ سزا بھی کار لا حاصل ہی ہے)

نمبر۴ :اگر نجات کے لئے نیک اعمال ضروری نہیں ہیں، جیسا کہ مسیحی دوست دعویٰ کیا کرتے ہیں، تو پھر نجات تو ہر نیک و بد کے لیے لازم اور سستی ترین ٹھہری جس کے لیے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں. اس صورت میں ظالم اور مظلوم خدا کی عدالت میں پہنچ کر بھی یکساں مرتبہ یعنی نجات یافتہ ٹھہرے، کیا یہ بات اصول عدل کے خلاف نہیں؟ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہو جائے گا کہ اگر ظالم و مظلوم دادرسی کے بغیر نجات یافتہ ہیں تو پھر خدا کے ایسے عدل کو کیا نام دیں

گے؟ اصل سوال تو یہ ہوگا کہ کیا یہ عدل ہے بھی یا نہیں؟

(ا) المسیح کے فقط صلیب پر بہے خون پر ایمان رکھنے کی صورت میں لوگوں کو اچھائی یا نیکی کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کیا مسیحیت اس صورت میں برائی اور ظلم وستم کو ترقی نہیں دیتی؟

(ب) یہ سستی نجات اس انجیلی اصول کے سے بھی متصادم ہے کہ جب راستباز ہی مشکل سے نجات پائیں گے تو پھر گناہ گاروں کا کیا ٹھکانہ (1۔پطرس 4:18)

نمبر۵: کیا دور فضل ہی دور نجات ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر کیوں کوئی حساب دے گا؟ یوں بھی پولوس کہہ چکے ہیں کہ جو یسوع مسیح میں ہیں ان پر عذاب کا فتویٰ نہیں (رومیوں ب 8) کیا یہ رعایت ان مسیحی دوستوں کو بھی حاصل ہوگی جو یسوع مسیح کی زمینی تعلیم پر عمل پیرا رہے یا لازمی ہے کہ انہیں بھی یسوع مسیح کی تعلیمات کے علاوہ مسیحیت میں موجود دوسروں کی تعلیم پر بھی ایمان لانا اور عمل کرنا ہوگا؟

مسیحیت اور مسئلہ نجات:

مسیحیت اور مسئلہ نجات کا باہمی تعلق منقطع نہیں کیا جا سکتا. مسیحی تھیالوجی کی بنیاد ہی اس نظریہ پر استوار ہے کہ اگر نجات نہیں تو پھر مسیحیت بھی نہیں. اناجیل میں یسوع مسیح کی ساری منادی کا محور یہی مسئلہ نجات ہے لیکن یہ معاملہ اہم ہونے کے باوجود اتنا ژولیدہ خیالی کا شکار ہے کہ حیرت ہونے لگتی ہے عملی پہلو کی نسبت خوش لفاظی کا عنصر بہت نمایاں ہے. باشعور قاری حتمی طور پر اس سوال کا جواب پانے سے قاصر رہتا ہے کہ وہ انجیل پر ایمان لا کر کیونکر نجات حاصل کر سکتا ہے. اپنی اہمیت کے پیش نظر مسئلہ نجات مبہم اور منتشر الخیالی کا شکار ہونے کی بجائے واضح اور غیر تاویلی ہونا چاہیے تھا تا کہ کسی بھی قسم کی غیر متعلقہ رائے یا صورت کی دخل اندازی سے بچا جا سکے لیکن بد قسمتی سے ایسا نہیں ہے۔

یسوع مسیح کا رائے مسئلہ نجات پر:

ہمیں دیکھنا چاہئے کہ یسوع مسیح مسئلہ نجات پر کیا رائے رکھتے ہیں.ان کے کچھ اقوال پر نظر ڈالنا مناسب رہے گا۔

یسوع مسیح کا فرمان ہے کہ انسان اپنے اعمال کا بدلہ پائیں گے یعنی کہ نجات کا انحصار اعمال پر ہے :

''ہر ایک کو اُس کے کاموں کے مُطابِق بدلہ دے گا''۔(متی 16:27)

''وہ وقت آتا ہے کہ جِتنے قبروں میں ہیں اُس کی آواز سُن کر نِکلیں گے۔ جِنہوں نے نیکی کی ہے زِندگی کی قیامت کے واسطے اور جِنہوں نے بدی کی ہے سزا کی قیامت کے واسطے''۔(یُوحنّا 5:29)

جو یسوع پر ایمان نہیں لائے گا وہ مستوجب مواخذہ ہوگا چاہے وہ دیگر انبیاء کرام اور صحف پر ایمان و عمل کیوں نہ رکھتا ہو:

''جو اِیمان لائے اور بپتِسمہ لے وہ نجات پائے گا اور جو اِیمان نہ لائے وہ مُجرِم ٹھہرایا جائے گا''۔(مرقس 16:16)

''جو کوئی اُس پر اِیمان لائے ہلاک نہ ہو بلکہ ہمیشہ کی زِندگی پائے۔ کیونکہ خُدا نے بیٹے کو دُنیا میں اِس لِئے نہیں بھیجا کہ دُنیا پر سزا کا حُکم کرے بلکہ اِس لِئے کہ دُنیا اُس کے وسِیلہ سے نجات پائے''۔(یُوحنّا 3:16)

''جو بیٹے پر اِیمان لاتا ہے ہمیشہ کی زِندگی اُس کی ہے لیکن جو بیٹے کی نہیں مانتا زِندگی کو نہ دیکھے گا بلکہ اُس پر خُدا کا غضب رہتا ہے''۔(یُوحنّا 3:36)

نجات کے مستحق کون لوگ ہوں گے؟

''جو آخر تک برداشت کرے گا وُہی نجات پائے گا''۔(متی 10:22 و

24:13 / مرقس 13:13)

''وہ لوگ نجات حاصل کرنے کے اہل ہیں جو چھوٹے بچوں کی مانند خود کو بدلیں گے''۔(متی 18:3)

''صرف وہ جو ایمان لاتے ہیں اور بپتسمہ لیتے ہیں نجات حاصل کر سکتے ہیں ''۔(مرقس 16:16)

''جو روح اور پانی سے پیدا ہوتے ہیں۔ یِسُوعؔ نے جواب دِیا کہ مَیں تُجھ سے سچ کہتا ہُوں جب تک کوئی آدمی پانی اور رُوح سے پَیدا نہ ہو وہ خُدا کی بادشاہی میں داخِل نہیں ہوسکتا''۔(یُوحنّا 3:5)

انسان کے اپنے منہ کے الفاظ باعث نجات ہوں گے:

''تُو اپنی باتوں کے سبب سے راست باز ٹھہرایا جائے گا اور اپنی باتوں کے سبب سے قُصُوروار ٹھہرایا جائے گا''۔(متی 12:37)

کیا شریعت پر عمل باعثِ نجات ہوگا؟ یسوع مسیح اس کا جواب اثبات میں دیتے ہیں:

''ایک شخص نے پاس آ کر اُس سے کہا اَے اُستاد مَیں کون سی نیکی کرُوں تا کہ ہمیشہ کی زِندگی پاؤں؟ اس نے اس سے کہا اگر تُو زِندگی میں داخِل ہونا چاہتا ہے تو حُکموں پر عمل کر۔ اُس نے اُس سے کہا کون سے حُکموں پر؟ یِسُوعؔ نے کہا یہ کہ خُون نہ کر۔ زِنا نہ کر۔ چوری نہ کر۔ جُھوٹی گواہی نہ دے۔ اپنے باپ کی اور ماں کی عِزّت کر اور اپنے پڑوسی سے اپنی مانِند مُحبّت رکھ۔ اُس جوان نے اُس سے کہا کہ مَیں نے اِن سب پر عمل کِیا ہے۔ اب مُجھ میں کس بات کی کمی ہے؟ یِسُوعؔ نے اُس سے کہا اگر تُو کامِل ہونا چاہتا ہے تو جا اپنا مال و اسباب بیچ کر غرِیبوں کو دے۔ تُجھے آسمان پر خزانہ مِلے گا اور آ کر میرے پیچھے ہو لے''۔(متی 19:16)

خدا کا نام لینے والا ہر شخص بھی نہیں بچایا جا سکے گا:

’’جو مُجھ سے اَے خُداوند اَے خُداوند! کہتے ہیں اُن میں سے ہر ایک آسمان کی بادشاہی میں داخِل نہ ہوگا‘‘۔(متی 7:21)

نجات کے طالب ہی نجات حاصل کرسکیں گے:

’’مانگو تو تُم کو دِیا جائے گا۔ ڈُھونڈو تو پاؤ گے۔ دروازہ کھٹکھٹاؤ تو تُمہارے واسطے کھولا جائے گا۔ کیونکہ جو کوئی مانگتا ہے اُسے مِلتا ہے اور جو ڈُھونڈتا ہے وہ پاتا ہے اور جو کھٹکھٹاتا ہے اُس کے واسطے کھولا جائے گا‘‘۔(متی 7:7)

خدا اور انسان سے پیار کرنے والے نجات حاصل کریں گے:

’’ایک عالِمِ شرع اُٹھا اور یہ کہہ کر اُس کی آزمایش کرنے لگا کہ اَے اُستاد! مَیں کیا کرُوں کہ ہمیشہ کی زِندگی کا وارِث بنُوں؟ اُس نے اُس سے کہا تَورَیت میں کیا لِکھا ہے؟ تُو کِس طرح پڑھتا ہے؟ اُس نے جواب میں کہا کہ خُداوند اپنے خُدا سے اپنے سارے دِل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری طاقت اور اپنی ساری عقل سے مُحبّت رکھ اور اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محُبّت رکھ۔ اُس نے اُس سے کہا تُو نے ٹھیک جواب دِیا۔ یہی کر تو تُو جِئے گا‘‘۔(لوقا 10:25)

جن کی راستبازی فقیہوں اور فریسیوں سے زیادہ ہوگی وہ نجات حاصل کریں گے:

’’اگر تُمہاری راست بازی فقِیہوں اور فرِیسیوں کی راست بازی سے زِیادہ نہ ہوگی تو تُم آسمان کی بادشاہی میں ہرگز داخِل نہ ہوگے‘‘۔(متی 5:20)

’’وہ نجات حاصل کریں گے جو شریعت پر عمل پیرا ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی دولت غریبوں میں تقسیم کر دیں گے اور یسوع کے پیچھے پیچھے چلیں گے‘‘(لوقا 18:18)

جو یسوع پر ایمان رکھیں گے:

’’جو بیٹے پر اِیمان لاتا ہے ہمیشہ کی زِندگی اُس کی ہے‘‘۔(یُوحنّا 3:36)

’’جو یسوع کا کلام سنتے ہیں اوراس کے بھیجنے والے پر ایمان رکھتے ہیں وہ نجات کے حق دار ہیں‘‘۔(یُوحنّا 5:24)

’’جنہیں چنا گیا ہے اور خدا انہیں خود نجات کے لئے خود بلائے گا‘‘۔(متی 22:14)

’’جوامیر یا دولتمند نہیں ہوں گے. یسوع نے دولتمند کا خدا کی بادشاہی میں داخلہ ناممکن بتایا ہے‘‘۔(متی 19:23)

۲۵)فقط وہی جو یسوع کا خون پئیں گے اور گوشت کھائیں گے(یُوحنّا 6:54)(۲۶

’’جنہیں یسوع آسمان پر کھینچ لے گا.مَیں اگر زمین سے اُونچے پر چڑھایا جاؤں گا توسب کو اپنے پاس کھینچُوں گا‘‘۔(یُوحنّا 32:12)

’’کیا ہم فضل سے بچائے جائیں گے؟نہیں ایک شخص نے پاس آ کر اُس سے کہا اَے اُستاد مَیں کَون سی نیکی کرُوں تا کہ ہمیشہ کی زِندگی پاؤں؟ اس نے اس سے کہا اگر تُو زِندگی میں داخِل ہونا چاہتا ہےتو حُکموں پر عمل کر۔ اُس نے اُس سے کہا کَون سے حُکموں پر؟ یِسُوع نے کہا یہ کہ خُون نہ کر۔ زِنا نہ کر۔ چوری نہ کر۔ جُھوٹی گواہی نہ دے۔ اپنے باپ کی اور ماں کی عِزّت کراور اپنے پڑوسی سے اپنی مانِند محُبّت رکھ۔ اُس جوان نے اُس سے کہا کہ مَیں نے اِن سب پر عمل کِیا ہے۔ اب مُجھ میں کس بات کی کمی ہے؟ یِسُوع نے اُس سے کہا اگر تُو کامِل ہونا چاہتا ہےتو جا اپنا مال و اسباب بیچ کر غرِیبوں کو دے۔ تُجھے آسمان پر خزانہ مِلے گا اور آ کر میرے پیچھے ہو لے‘‘۔ (متی 19:16)

مسیحی پوادر پر اتمام حجت:

عقائد پر مختصر سا جائزہ لینے کے بعد ہم سبھی دوستوں کو یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ ہم نے سوچا کہ شاید مسیحی عقائد سمجھنا ہمارے بس کی بات نہیں اور اس علمی سفر میں مسیحی دوست بھی ہمیں بار بار یہی طعنہ دیتے رہے کہ چونکہ ہم روح القدس کی تائید سے محروم ہیں اس لیے ہمیں روح القدس سے معمور مسیحی بزرگان سے مدد طلب کرنی چاہیے۔سو واضح ہو کہ سیدنا یسوع مسیح کے اس فرمان کہ:

"اگر کوئی مُجھ میں قائم نہ رہے تو وہ ڈالی کی طرح پھینک دِیا جاتا اور سُوکھ جاتا ہے اور لوگ اُنہیں جمع کر کے آگ میں جھونک دیتے ہیں اور وہ جل جاتی ہیں۔ اگر تُم مُجھ میں قائم رہو اور میری باتیں تُم میں قائم رہیں تو جو چاہو مانگو۔ وہ تُمہارے لِئے ہو جائے گا"۔(یوحنا 15:6)

کے پیشِ نظر سبھی پر جوش پادری صاحبان، جو یسوع علیہ السلام مسیح میں قائم ہیں اور سیدنا المسیح المبارک ان میں، کو نہایت صدق دل سے امید بھری نظروں سے مدد کے لیے پکارا۔ہمیں یہ کامل یقین تھا کہ پوادر میں خداوند کی روح کام کرتی ہے اور وہ جو چاہیں مانگ لیں ان کے لئے ہوگا.
ہم نے محترم جناب شفیق کنول صاحب اور جوشوا اسلم اسلم صاحب اور محترم جناب ضیاء المسیح صاحب جیسے معروف پاسٹر صاحبان کے ساتھ ساتھ ان کے معاونین جناب قیوم بہادر صاحب اور میتھیو سولومن صاحب (کل پانچ صاحبان) کو پکارا تا کہ وہ خود کو سیدنا یسوع مسیح کے اس قول مبارک کے مصداق ٹھہرائیں اور ہمیں بلا کسی شرط کے بپتسمہ دے کر مسیح علیہ السلام کے قدموں میں بٹھا دیں. ہمارے نزدیک یہ ان صاحبان کے لیے بھی سعادت تھی اور ہمارے لئے بھی.لیکن انہوں نے اس پکار پر کان نہیں دھرا. اب ایک بار پھر ہم انہیں دعوت دیتے ہیں کہ وہ خود کو سیدنا یسوع مسیح کے قول کا مصداق ثابت کرنے کے لیے وہ ہمارے لئے کچھ ایسا کام کر کے دکھائیں

جو خدا کی طرف سے ظاہر ہوتا ہو نا کہ اس انسانی بساط کا عمل دخل ظاہر ہوتا ہو۔ مثلاً ان کاموں سے کوئی ایک کام تسلی بخش ثابت ہو سکتا ہے۔

(۱) شفا دہی سے میری چالیس سال پرانی عینک لگانے کی عادت ترک کروا سکتے ہیں۔ (یہ ذاتی تجربہ شمار ہوگا)

(۲) کوئی مہلک زہر کھا کر بھی بچ رہنے کا مظاہرہ بھی انجیلی معیار کے عین مطابق ہی ہے۔ یہ بھی قابلِ قبول ہوگا لیکن زہر فراہم کرنے کی ذمہ داری ہم نبھائیں گے۔

(۳) کسی درخت کو چلانے کا مظاہرہ بھی تشفی بخش رہے گا۔

(۴) مذکورہ بالا صاحبان، جنہیں یہ سمجھتے ہوئے بلایا گیا ہے کہ خداوند کی روح ان میں کام کرتی ہے، خود انجیلی معیار کے مطابق کوئی مظاہرہ تجویز کر سکتے ہیں۔ پانچوں میں سے کوئی ایک دوست بھی انجیلی آزمائش پر پورا اترا تو یہ کافی خیال کیا جائے گا اور یہ مظاہرہ سبھی کی طرف سے متصور ہوگا لیکن اگر یہ پانچوں صاحبان انجیلی اور یسوعی معیار پر پورا اترنے سے قاصر رہے تو یقیناً ہم انہیں سیدنا یسوع علیہ السلام مسیح کے ان الفاظ کا مصداق قرار دینے میں حق بجانب ہوں گے:

"مَیں تُم سے سچ کہتا ہُوں کہ تُم مُجھے اِس لِئے نہیں ڈُھونڈتے کہ مُعجزے دیکھے بلکہ اِس لِئے کہ تُم روٹِیاں کھا کر سیر ہُوئے"۔ (یوحنا 6:26)

آپ کو ہم خادمین نہیں بلکہ پیٹ پرست دین فروش قرار دینے میں حق بجانب ہوں گے یعنی کہ سیدنا یسوع علیہ السلام مسیح کا مبارک نام بیچ کر پیٹ پوجا کرنے والے بال آپ کے کورٹ میں ہے۔ یہ دو طریقے ہیں سے آپ باہر نکال سکتے ہیں:

اول آپ انجیلی معیار پر پورا اتریں دوم آپ انجیل یوحنا والے فتویٰ کا اپنے آپ پر لاگو ہونے کا اقرار کرلیں۔ دوسری آپشن اختیار کرنے پر آپ کو ہم خادمین نہیں بلکہ پیٹ پرست دین فروش قرار دینے میں حق بجانب ہوں گے جن کے پاس سچائی کی رمق تک نہیں۔ یہ نتیجہ اس لئے کہ

اگر تم ابراہیم کے فرزند ہوتے تو پھر ابراہیم کے سے کام کرتے. جواب میں مسیحی دوست اگر یہ فرمائیں کہ بائبل میں لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو مت آزما تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم خدا کو نہیں مسیحیوں کو آزما رہے ہیں جنہیں اپنا ایمان آزمانے کی بائبل مقدس میں ہدایت کی گئی ہے تاکہ وہ نامقبول نہ ٹھہریں. ہم ان کی کٹ حجتی ختم کرنے کے لیے بائبل مقدس کا فرمان نقل کئے دیتے ہیں:

> ’’تُم اپنے آپ کو آزماؤ کہ اِیمان پر ہو یا نہیں۔ اپنے آپ کو جانچو۔ کیا تُم اپنی بابت یہ نہیں جانتے کہ یِسُوعؔ مسیح تُم میں ہے؟ ورنہ تُم نامقبُول ہو۔ لیکن مَیں اُمید کرتا ہُوں کہ تُم معلُوم کرلو گے کہ ہم تو نامقبُول نہیں‘‘۔(2۔کرنتھیوں 13:5)

پس آپ کا اپنے آپ کو آزمانا خدا کو آزمانا نہیں ہے بلکہ ضروری ہے. اگر آپ خود ہی نامقبول ہیں تو پھر آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ آپ اپنے رزق روٹی کے لیے ہمارے ایمان سے کھیلیں. اگر آپ مقبول ہیں تو ثبوت دیجئے. ویسے بھی پادری خدا نہیں کہ اسے آزمایا نہ جائے۔

نوٹ: چونکہ پاسٹر مبین اختر صاحب نے بھی اس بحث کے دوران ہماری تلاش و تفتیش پر پھبتیاں کسنا اپنا فریضہ سمجھا اس لئے یہی دعوت انہی الفاظ میں انہیں بھی دی جاتی ہے۔

فصل پنجم کیا یسوعؑ کی بحیثیت مسیح عہد قدیم میں کوئی شناخت موجود ہے:

عقائد کا مختصر سا جائزہ لینے اور ممتاز مسیحی منادین کو مدد کے لیے پکارنے اور ان کی خاموشی کے بعد ہم اس طرف رجوع کرتے ہیں کہ کیا سیدنا یسوع علیہ السلام کی بحیثیت مسیح عہد قدیم میں کوئی شناخت موجود ہے. اگر تو کوئی شناخت موجود نہیں تو پھر مسیحی برادری کو صاف صاف اقرار کر لینا چاہیے کہ ایسا کچھ موجود نہیں. اس سے ان کا مقدمہ مضبوط ہی ہوگا کمزور نہیں کیونکہ لازمی نہیں ہے

کہ کسی نبی کی پیشین گوئی پہلے سے موجود ہو لیکن اگر وہ اصرار فرماتے ہیں کہ سیدنا یسوع علیہ السلام بحیثیت مسیح عہد قدیم میں موجود ہیں تو پھر ان کے پیش کردہ دلائل کا جائزہ لینا از حد ضروری ہو جاتا ہے تا کہ یسوع کو بحیثیت صادق مسیح شناخت کیا جا سکے۔ اس مرحلے پر ہمیں تین امور کا خاص خیال رکھنا پڑے گا۔

اول مسیحی علماء کرام کی طرف سے مسیح کے بارے اپنائے گئے عہد قدیم سے اقتباسات۔

دوم عہد قدیم کی وہ عبارات جنہیں یہودی تو مسیح کی شناخت کے لئے لازم خیال کرتے ہیں لیکن مسیحی علم الکلام میں انہیں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

سوم پہلے دو امور کو قطعی نظر انداز کر کے فقط کرشماتی لحاظ سے المسیح کی شناخت۔

اس طریق سے ہی ہم صادق مسیح کی شناخت با آسانی کر سکتے ہیں۔ (یاد رہے کہ ہمیں سیدنا یسوع علیہ السلام کی انجیلی تصویر کو ہی پرکھنا ہے اسلامی تصویر کا تقابل یہاں غیر متعلقہ ہے) انجیل میں عہد قدیم میں بتائی گئی نشانیاں عمومی انداز میں نظر انداز کر کے یسوع کے معجزات کو ہی ان کی اصل شناخت قرار دیا گیا ہے۔

سیدنا یسوع فرماتے ہیں کہ:

''جو کام مَیں اپنے باپ کے نام سے کرتا ہُوں وُہی میرے گواہ ہیں''۔ (یوحنا 10:25)

''میرے کاموں ہی کے سبب سے میرا یقین کرو''۔ (یوحنا 14:11)

انجیل مقدس سے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ یہودی عہد قدیم کی عبارات کی بنیاد پر نہیں بلکہ کرشمے دیکھ کر المسیح شناخت کرنے کے خواہاں تھے۔

''اُنہوں نے اُس سے کہا پِھر تُو کَون سا نِشان دِکھاتا ہے تاکہ ہم دیکھ کر تیرا یقِین کریں؟ تُو کَون سا کام کرتا ہے؟''۔ (یوحنا 6:30)

انجیل میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ:

''بہتیرے اُس پر اِیمان لائے اور کہنے لگے کہ مسیح جب آئے گا تو کیا اِن سے زِیادہ مُعجِزے دِکھائے گا جو اِس نے دِکھائے؟''۔(یوحنا7:31)

یعنی کہ یسوع پر ایمان لانے والے یہ یہودی کتاب مقدس میں بتائی گئی نشانیاں چھوڑ کر فقط کرشمے دیکھ کر ہی ایمان لے آئے۔

سوال یہ ہے کہ کیا المسیح کی پہچان اس کے ان کاموں کے سبب سے ہونی چاہئے تھی جو مقدس متن میں بتائے گئے ہیں یا پھر ان کاموں سے جنہیں مسیح ہونے کا کوئی دعویدار اپنی مرضی سے دکھلاتا؟ پس یہاں اس امر کا تصفیہ لازم ہے کہ المسیح کی شناخت کتاب مقدس کے مطابق ہونی چاہیے تھی یا دکھائے گئے کرشمات پر۔ یہ نکتہ ذہن نشین رہنا چاہیے کہ یسوع خود بھی ایسے کرشمات دکھانے کو حقانیت کی مطلوبہ دلیل تصور نہیں فرماتے۔ ان کے مطابق جھوٹے نبی اور جھوٹے مسیح کرشمات دکھا کر برگزیدوں تک کو گمراہ کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ (متی 24:24)

دراصل یہاں تنقیح طلب امر یہ ہے کہ اگر جھوٹے نبی بھی معجزات دکھا سکتے ہیں تو پھر سچے اور جھوٹے انبیاء کے معجزات کے درمیان امتیاز کیا ہے اور کیسے ہوگا اور کون کرے گا۔

اگرچہ انجیل میں صداقت یسوع کے اثبات کی خاطر ان کے معجزات پر تکیہ کیا جاتا ہے لیکن یہ التزام بہرحال موجود رکھا جاتا ہے کہ عہد قدیم سے بعثت مسیح کا تعلق ٹوٹنے نہ پائے بلکہ باقی رہے تاکہ قاری کو یہ تاثر دیا جا سکے کہ یسوع کے یہ کام قدیم مقدس نوشتوں کے عین مطابق ہی ہیں لیکن ذرا سی تحقیق سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ ایک مغالطہ ہے۔ مسیحی علمی حلقے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یسوع کی بابت ساڑھے تین سو پیش گوئیاں عہد قدیم میں موجود ہیں لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ جن ورسز کو پیش گوئیاں باور کرایا جاتا ہے ان میں پیش گوئی ہونے کا قرینہ یا تو سرے سے

موجود ہی نہیں ہوتا یا اگر یہ عبارت کسی طور پیش گوئی شمار ہونے کے لائق بھی ہو تو یہ نہ وصفی اور نہ ہی لفظی یا معنوی اعتبار سے یسوع کے حالات پر منطبق ہوتی ہے۔

بائبل مقدس سے ان پیش گوئیوں کے اصول استخراج اور استنباط کیا ہیں، مسیحی علماء کرام کبھی بھی نہیں بتاتے. لے دے کے یہی بتایا جاتا ہے کہ کلیسیا یہ ورسز (جنھیں وہ پیش گوئی کا نام دیتے ہیں) المسیح کے متعلق تصور کرتی ہے۔

مسیحی دلائل کا تجزیہ:

یسوع پر منطبق کی جانے والی سبھی عبارات کا تجزیہ تو مختصر مضمون میں ممکن نہیں اس لئے چیدہ چیدہ بائبلی عبارات پر ہی گفتگو ممکن ہو سکے گی. سب سے مشہور ورس جسے مسیحی دلیلیوں کی طرف سے پیش گوئی بنا کر سامنے رکھا جاتا ہے وہ ہے کتاب پیدائش کی یہ عبارت:

> ''مَیں تیرے اور عَورت کے درمیان اور تیری نسل اور عَورت کی نسل کے درمِیان عداوت ڈالُوں گا۔ وہ تیرے سر کو کُچلے گا اور تُو اُس کی ایڑی پر کاٹے گا''۔ (پیدائش 3:15)

صاف ظاہر ہے کہ یہ ورس اپنے سیاق وسباق میں کسی بھی طرح یسوع پر موزوں نہیں ہوتی لیکن اس کے باوجود ہر مسیحی بڑے اعتماد اور بڑی تعلیٰ وتحدی سے اسے المسیح کی پیش گوئی بتا کر غیر مسیحی مبتدین کے سامنے پیش کرتا ہے. دلیل یہ ہے کہ یسوع کنواری مریم کے بطن سے پیدا ہونے کے ناتے عورت کی نسل کہلانے کے تنہا حق دار ہیں. اگر یہ دعویٰ (کہ یسوع ہی تنہا عورت کی نسل کہلا سکتے ہیں) کسی طرح قابلِ تسلیم ہو تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ شیطان فقط یسوع کا ہی دشمن تھا، ہے اور رہے گا.اس کے علاوہ وہ کسی کا دشمن نہیں کیونکہ وہی تنہا فرد ہیں جو عورت کی نسل کہلا سکتے ہیں اور عام انسانوں کا اس سے کچھ لینا دینا ہی نہیں بنتا اور نہ ہی شیطان ورس کے

استنباط کے مطابق ان کا دشمن ہے. یعنی کہ یہ مسیحی مغالطہ ہے کہ شیطان کی انسان دشمنی کو تمام انسانوں پر محیط تصور کرتے ہیں جبکہ ان کے نزدیک آیت تو ایک فرد ہی متعین کرتی ہے. اس کے علاوہ سانپ تو یہاں استعارۃً بھی شیطان نہیں ہے بلکہ واضح طور پر ایک دشتی جانور تھا جسے اپنے کئے کی سزا بھی ملی اور وہ آج تک سزا کے نتیجے میں پیٹ کے بل رینگتا ہے. ایک دشتی جانور کو علامتی ہستی بنا کر پیش کرنا، جس کا کوئی قرینہ موجود نہیں، اگر سینہ زوری پر کلام مقدس کا مفہوم بگاڑنا نہیں تو اس کا حقیقی مفہوم بھی نہیں. سانپ کیوں انسان کو جنت یا باغ عدن سے نکالنے کے لیے بے تاب تھا؟ اس کی کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے لیکن مسیحی ذاتی رائے کے بغیر یہ وجہ بتا نہیں سکتے. حقیقی بات تو یہ ہے کہ توریت مقدس عہد جدید کے عطا کردہ تصور شیطان سے قطعی خالی ہے. اس صورت میں بھی ہم یسوع مسیح پر اس آیت کو چسپاں کرنا کلام مقدس کی روح کے منافی پاتے ہیں. مسیحی تحدی و تعلّی کی رکاکت واضح ہے. کیا مسیحیت کی بنیاد ایسی ہی دور از کار کلام مقدس بگاڑنے والی تشریحات پر رکھی گئی ہے جن کا یسوع سے کوئی تعلق نہیں؟ میں تو اس سوال کا جواب ہاں میں پاتا ہوں. اگر کوئی مسیحی اس کا جواب نفی میں دینا چاہے تو لازم ہے کہ وہ اپنے دلائل پیش فرمائے، ہم چشم براہ ہیں۔

کیا یسوع مسیح فی الواقع کنواری کے بیٹے ہیں؟ اگر وہ سب نشان جو پیدائش مسیح کے موقع پر متی اور لوقا کی تصریحات کے بموجب دکھائے گئے، صادق اور شک و شبہ سے بالا ہیں تو پھر یسوع نے کیوں انہیں اپنی صداقت کے اثبات میں قوم کے سامنے نہیں رکھا یا لوگوں کو یاد دلایا؟ عہد جدید کا اولین حصہ یعنی خطوط پولس اس بابت خاموش ہے اور یسوع نے کنواری کا بیٹا ہونے کے ناطے اپنے کسی دعوے کی بنیاد نہیں رکھی. یہ نکتہ بھی اپنی جگہ بہت اہم ہے کہ کیا یسوع اکیلے ہی کنواری کے بیٹے تھے اور ان کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا؟ عہد قدیم میں اس بابت کوئی بھی پیش گوئی یا صراحت موجود نہیں ہے۔ لے دے کر اشعیا 14:7 کو یسوع کے متعلق پیش گوئی بنا کر

پیش کیا جاتا ہے لیکن یہ عبارت کسی بھی طرح اپنے اصل سیاق و سباق میں یسوع کے متعلق ثابت نہیں ہوتی۔ وہاں جس جوان عورت کا تذکرہ موجود ہے وہ بالآخر اپنے شوہر سے بچہ جنتی ہے اور یوں اس کا مریم کی انجیلی تصویر سے کوئی بھی ربط ضبط باقی نہیں رہتا۔ اگر کسی طور زبردستی یہ ربط ضبط جوڑنا ہی پڑے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس ورس کے مصداق یسوع مسیح بھی بن باپ پیدا نہیں ہوئے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ عورت کی نسل سے اور کنواری کا بیٹا ہونے کا تعلق کتاب پیدائش اور اشعیا کی ان ورسز سے کب اور کس نے کس بنیاد پر جوڑا؟ اس سوال کا جواب حتمی طور پر کوئی بھی نہیں جانتا۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ ورسز یسوع کے بہت بعد میں ان سے نتھی کی گئیں ہیں اور انجیل میں ان سے یسوع کا براہ راست تعلق موجود نہیں اور جو تذکرہ موجود ہے وہ انجیل نویس کے دہائیوں بعد اپنے ریمارکس ہیں۔ دوسرا اہم ترین سوال یہ ہے کہ کیا یہود نے کبھی اس آیت کو مسیح کی آمد کی اطلاع جانا یا وہ معنی اسے پہنائے جو مسیحی پہناتے ہیں؟ ایمانداری سے کام لینے والا کوئی بھی شخص اس سوال کا جواب اثبات میں نہیں دے سکتا۔ یسوع کی لاعلمی میں ان کی پیدائش کو بنیاد بنا کر ان کی بعثت سے یہ ورسز بہت بعد میں جوڑی گئیں یعنی کہ دور کی کوڑی لائی گئی ہے۔ یسوع کی بعثت سے ان آیات کا کوئی تعلق ہوتا تو وہ خود اس کی تعلیم دیتے۔ متی میں اشعیا کا حوالہ دراصل متی کے اپنے ریمارکس ہیں۔

اہم سوال یہ ہے کہ مسیحی کتاب مقدس میں مذکور ان پیش گوئیوں پر توجہ کیوں نہیں دیتے جو صحیح معنوں میں پیش گوئیاں کہلا سکتی ہیں اور اپنے مفہوم میں زیادہ واضح ہیں؟ اس کا جواب تو آگے چل کر دیں گے لیکن فی الحال نمونے کے طور پر ایک دو ورسز نقل کیئے دیتا ہوں۔

زکریا باب 6 میں مرقوم ہے:

”ربُّ الافواج یُوں فرماتا ہے کہ دیکھ وہ شخص جِس کا نام شاخ ہے اُس کے زیرِ سایہ خُوش حالی ہوگی اور وہ خُداوند کی ہَیکل کو تعمِیر کرے گا۔ ہاں وُہی خُداوند کی ہَیکل کو

بنائے گا اور وہ صاحبِ شوکت ہوگا اور تخت نشین ہو کر حکومت کرے گا اور اُس کے ساتھ کاہن بھی تخت نشین ہوگا اور دونوں میں صلح وسلامتی کی مشورت ہوگی''۔

کون نہیں جانتا کہ مسیحی اشعیا کی کتاب میں مذکور نصر بمعنی شاخ [(11:1)و(53:2)] کا مصداق یسوع کو ہی جانتے ہیں انجیل کی تفاسیر میں یسوع کو شاخ ہی کہا جاتا ہے۔

اسی طرح عاموس کی کتاب میں لکھا ہے:

''مَیں اُس روز داؤد کے گرے ہُوئے مسکن کو کھڑا کر کے اُس کے رخنوں کو بند کرُوں گا اور اُس کے کھنڈر کی مرمّت کر کے اُسے پہلے کی طرح تعمیر کرُوں گا۔ تا کہ وہ ادُوم کے بقیہ اور اُن سب قوموں پر جو میرے نام سے کہلاتی ہیں قابض ہوں''۔(عاموس 9:11)

یہودی یہ عبارت المسیح کے متعلق خیال کرتے ہیں یسوع نے نہ تو یہود کے اس فاسد خیال کی تردید واصلاح کی اور نہ ہی اس پر پورا اترے. ہر دوصورتوں میں مسیح ہونے کی دعویدار شخصیت پر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ یا تو وہ اس پر پورا اترتی یا پھر قوم کے غلط تصورات کی اصلاح کرتی. ہم نے اوپر جو سوال کیا تھا اس کا واضح جواب یہ ہے کہ یسوع مسیح ان ورسز پر کسی بھی طور پورا نہیں اتر پائے اور نتیجتاً یہود کی نظروں میں مسیح کا مقام پانے سے قاصر رہے. اناجیل ادنی درجے میں بھی یہ وضاحت کرنے سے قاصر رہی ہیں کہ ایسے مقامات کی یسوع نے کیا توجیہہ فرمائی تھی. ظاہری طور پر یسوع مسیح نے ہیکل کی تعمیر نہیں کی بلکہ معاملہ برعکس رہا کہ جو عمارت موجود تھی وہ بھی بعثت یسوع کے بعد منہدم کردی گئی. یسوع کے ساتھ کسی کاہن کی تخت نشینی تو ایک طرف رہی خود یسوع بقول انجیل نویسوں کے غیر اقوام کی عدالت میں پیش ہوتے رہے کیا کوئی مسیحی بتا سکتا ہے کہ یسوع کی آمد سے داؤد کا گرا ہوا خیمہ کیسے ایستادہ ہوا اور اس کے رخنوں کی مرمت ہوئی؟ دراصل یسوع کے مسیح ہونے کی ساری عمارت تاویلات کے سہارے کھڑی ہے اور تاویلات بھی ایسی کہ

چپ ہی بھلی ۔اناجیل میں یسوع اپنے مسیح ہونے کی بابت مقدس نوشتوں کی کوئی تشریح کرتے نظر نہیں آتے ۔اس کی دوصورتیں ممکن ہیں ۔اول یسوع مسیح نے تشریح تو فرمائی لیکن انجیل نویسوں نے اپنے خودساختہ عقائدونظریات کے منافی پا کراس کا ذکر گول کر دیا اور یہودی اسے اپنے مفید مطلب نہ پا کر اسے قبول کرنے سے قاصر رہے یعنی کہ یسوع کی تشریحات نہ تو یہود کو قبول ہوئیں اور نہ ہی ان کے پیروکاروں کو جس کی وجہ سے وہ عدم تذکرہ کا شکار ہوگئیں ۔

دوم یسوع مسیح نے کوئی تشریح ان مقامات کی سرے سے ہی نہیں کی ۔اگر صورت اول پر یقین کرلیا جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ یسوع کی تشریحات بہر صورت نا قابل قبول تھیں لیکن جن لوگوں نے انہیں بطور مسیح قبول کیا انہوں نے کتاب مقدس کے مطابق نہیں بلکہ معجزات دیکھ کر لیکن یہ کتاب مقدس کا متعین کردہ معیار نہیں تھا ۔

تمت